احساس کی دنیا الفاظ کی دنیا سے مختلف ہے۔

احساس کی دنیا

تالیف:

ابوالفیض سعدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم،

صلّو علٰی الحبیب　　صلی اللہ علی محمد

احساس کی دنیا الفاظ کی دنیا سے بہت مختلف ہے۔

احساس کی دنیا

از: ابوالفیض سعدی

جملہ حقوق بحق کمپوزر محفوظ

تفصیلات

کتاب کا نام :احساس کی دنیا
تالیف :ابوالفیض سعدی
صفحات :۴۸
کمپوزنگ :ام،آر، کے کمپیوٹرس
قیمت :
ناشر :

فہرست مضامین

تقریظ

از: ڈاکٹر توصیف صاحب بریلوی

محمد فیض صاحب آپ کی یہ تحریر انشائیہ سے خاصی مشابہت رکھتی ہے اور بیچ بیچ میں کچھ اشعار کی پیروڈی کرتے ہوئے لکھا ہے جس سے لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔

ایک بات تو طے ہے کہ آپ کے یہاں انشائیہ نگاری کے جراثیم بدرجہ اتم موجود ہیں اور یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ آپ نے پطرس بخاری کے مضامین بھی مطالعے میں رکھے ہیں جو کہ اردو کے اعلی درجے کے انشائیہ نگار ہیں۔

امید ہے کہ آپ نے رشید احمد صدیقی، کنہیالال کپور، احمد جمال پاشا اور مشتاق احمد یوسفی کو بھی پڑھا ہوگا۔

ان تمام سے ذہن سازی کرتے ہوئے آگے بڑھیں، مزید لکھتے رہیں اور اپنی راہ علیحدہ بنائیں۔ اس میدان میں بہت کم طبع آزمائی کی جاتی ہے۔ کوشش کریں آپ کی تحریر میں بناوٹ نہ آنے پائے بلکہ اس کا فطری پن برقرار رکھیں۔

خواجہ حسن نظامی اور محمد حسین آزاد کے مضامین بھی پڑھیں۔ ان میں تفریح طبع کا سامان تو نہیں ہے البتہ ان دونوں کے مضامین آپ کے تخیل کو بالیدگی عطا کریں گے۔

آپ کے اس انشائیہ کے لیے بہت بہت مبارکباد! امید ہے کہ آنے والے وقت میں آپ کا کوئی اور انشائیہ بھی پڑھنے کو ملے گا۔ لکھتے پڑھتے رہیں۔

از: ڈاکٹر توصیف صاحب بریلوی
(اردو ادیب)

الحمد للّٰہ رب العلٰمین، و الصلوٰۃ و السلام علٰی سید المرسلین
وعلٰی اٰلہ و اصحابہ و بارک وسلم

خیر بچ گئی

کبھی کبھی کسی جگہ جانے کے بعد افسوس ہوتا ہے۔کاش نا ہی آتے تو بہتر تھا۔

کل ایسا ہی ہوا کچھ میرے ساتھ، کچھ احباب کے ساتھ، کسی کام سے چار مینار جانا ہوا۔

عصر بعد پہنچا وہ بھیڑ، توبہ! توبہ! یہ سوچ کر آگے بڑھتے گئے کہ شاید آگے راستہ صاف ہو مگر افسوس ہم جوں جوں آگے گئے بحر ظلمات میں پھنستے چلے گئے۔

اس وقت وہاں کا منظر دیکھ کر۔ یہ بات سمجھ آئی ہے۔ گر قلی قطب شاہ زندہ ہوتے، تو شاہی چار مینار کا نام بدل کر "عورتوں کا مینار رکھ دیتے۔

دراصل ہمیں جہاں جانا تھا اس کے لیے ہمیں مجبوراً عورتوں کے مینار کے پاس سے گزرنا پڑا کیوں کہ دوسرا راستہ ہمیں معلوم نہیں تھا، چلتے چلتے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے ہم دشمنوں کی فوج میں پھس گئے ہوں۔ کیوں کہ باد مخالف سے ہمیشہ بچ کر ہی رہنا بہتر ہے۔

سامنے طوفاں ہو تو ڈٹ جانا چاہیئے
مگر سامنے باد مخالف ہو تو ہٹ جانا چاہیئے

ایسی جگہوں پر چلنے میں بہت زیادہ آزمائش ہوتی ہے۔قدم پھوک پھوک کر رکھنا پڑتا ہے۔ایک آزمائش یہ کہ ایسی جگہوں سے جلدی سے نکلنا ہے۔دوسری آزمائش یہ کہ احتیاط سے، ورنہ جسم کی مالش کے لیے دنیا کا کوئی بھی تیل کارگر ثابت نہیں ہوگا۔تیز اور محتاط انداز میں چلنے کی وجہ سے بری طرح تھک گیا تھا۔ اکبر جیسا انسان بھی باد مخالف کے حملے کو برداشت نہیں کر سکا اور اپنی عاجزی کا برملا اعتراف کر بیٹھا۔

اکبر دبے نہیں کسی دشمن کی فوج سے
لیکن شہید ہوگئے بیوی کی نوج سے

دراصل ہمیں اس کا اندازہ نہیں تھا کہ اتنی زیادہ باد مخالف ہوگی۔

خیر جان بچی، عزت بچی واپس گھر لوٹا۔ مگر نہایت ہی خوشی کے ساتھ کیوں کہ جس کام کے لیے گیا تھا وہ نہیں ہوسکا۔

☆☆☆

دردِدل

میں کمرے میں بیٹھا ہوں، میرے سامنے مختلف کتابیں، قلم اور کاپیاں ترتیب وار رکھی ہیں۔

آج ذرا تاخیر سے اٹھا، ناشتہ کیا اور زیادہ وقت اپنے کمرے کی صفائی اور نہانے دھونے میں گزر گیا۔ ہم مسافروں کی بھی کیا زندگی ہے! پڑھنا، پڑھان، لکھنا، لکھانا، بچوں کو سمجھانا، کبھی ان کی کارکردگی سے خوش ہونا اور کبھی ان کی لاپرواہی، دل شکنی، سستی، کاہلی، ناشکری، بیقدری سے پریشان ہوجانا۔ ان کے فائدے کی باتیں بتانا، کبھی سختی کرنا۔

ایک استاد کی بھی زندگی بہت عجیب سی ہوتی ہے۔ کبھی مایوس ہوجاتا ہے کہ ہم جن کی بھلائی کے لیے رات دِن فکرمند رہتے ہیں۔ اپنی سب سے قیمتی چیز (وقت) ان کے لیے وقف کرتے ہیں۔ پھر بھی یہ بچے ہمیں پریشان کرتے ہیں۔ تکلیف دیتے ہیں۔ ایک حساس دل استاد کے لیے یہ بہت ہی صبر آزما گھڑی ہوتی ہے۔ کبھی دل کرتا ہے، تدریس چھوڑ کر کسی اور کام میں لگ جاؤں، کبھی ان کے رویے اور دل آزاری کی وجہ سے دل کرتا ہے۔ ان کو کچھ بھی نہیں سکھایا جائے۔ ان کے لے کچھ بھی نہ کیا جاے۔ پھر خیال آتا ہے ہم لوگ نہیں کریں گے، تو کون کرے گا۔ یہ اپنے ہی ہیں۔ آج نہیں سمجھ رہے۔ ہوسکتا ہے کل سمجھ آجائے۔

☆☆☆

رونے کی بھی طاقت نہیں، رونا تو یہی ہے

کبھی کبھی ہمیں لگتا ہے کہ ہم نے دوسروں کے ساتھ اچھا کیا ہے۔ لہذا بوقت ضرورت میرے ساتھ بھی وہ اچھا ہی کرے گا اور ساتھ دے گا، مگر بسا اوقات ہمیں اپنی سوچ وفکر پر بڑا ہی افسوس ہوتا ہے۔ پھر اس وقت ؟ کی تکلیف نا قابل برداشت ہوتی ہے۔

مجھے اس موقعے پر ایک کہانی یاد آگ ء۔ ایک پرندے نے دیکھا کہ ایک بکری کا بچہ شیر کے ساتھ کھیل رہا ہے۔

کبھی اس کی پیٹھ پر، کبھی زمیں پر، بکری بہت خوش ہے۔ پرندہ یہ منظر دیکھ کر، تعجب میں پڑ جاتا ہے۔ کہ یہ کیا دیکھ رہا ہوں! بالآخر

پرندے نے, شیر سے پوچھ ہی لیا، کہ یہ کیا ہے؟ شیر نے کہا کہ اس بکری نے مجھ پر احسان کیا ہے۔ اسی وجہ سے میں اسے نہیں کھا رہا ہوں۔۔ پرندے نے اس سے سبق لیا کہ کسی پر احسان کرنے سے وہ اپنا ہو جاتا ہے؟ وہ وہاں سے چلتا ہے۔ کچھ دور جا کر، ایک جگہ ایک چوہے کو نالی میں ڈوبتے ہوئے دیکھا۔ اس نے سوچا کہ اس کو بچایا جائے، یہ سوچ کر، وہ چوہے کو نالی سے اٹھاتا ہے اور باہر رکھ دیتا ہے، اب کیا دیکھ رہا ہے، کہ چوہا ٹھنڈ کی وجہ سے کانپ رہا ہے۔ پرندہ مزید احسان کرتے ہوئے اس کو اپنے پروں میں چھپا لیتا تا کہ اس کو گرمی پہنچے اور اس کی جان بچ جائے، کچھ دیر کے بعد پرندے نے کچھ کاٹنے کی آواز سنی، اس نے اس کو نظر انداز کیا، جب چوہا صحیح ہو گیا، تو پرندہ خوش ہو کر اڑنے کی کوشش کرتا ہے تب اس کو معلوم ہوتا ہے کہ چوہے نے اس کے دونوں پر کاٹ دیئے ہے۔

سوچوں تو ساری عمر محبت میں کٹ گئی
دیکھوں تو اک شخص بھی میرا نا ہوا

☆☆☆

غالب کا چیلا اور ٹھیلا

چیلا :استاد! تربوز کا ٹھیلا تیار ہے۔

(غالب اپنے کمرے میں ٹیک لگائے یہ گنگنا رہا تھا۔

بس کہہ لیتا ہوں، ہر مہینے قرض اور رہتی ہے سود کی
تکرار، میری تنخواہ میں ڈھائی کا ہو گیا ہے شریک ساہوکار)

چیلا :استاد! چلو! یہ شعر و شاعری چھوڑو! آج تربوز کا ٹھیلا، فلاں مزار پر لگانا ہے۔

غالب :ٹھیک ہے بھائی۔

(دراصل غالب اپنے قرضوں کے بار کو ہلکا کرنے کے لیے آج سے تربوز کا ٹھیلا لگانے جا رہا تھا)

غالب اپنے چیلے کے ساتھ ٹھیلا لے کر، مزار پر جا پہنچتا ہیا ور ایک پیڑ کے نیچے اپنا ٹھیلا لگا دیتا ہے اور گاہک کا

انتظار کرتا رہتا، مگر ہائے رے گاہک!

ع: ہم ہیں مشتاق وہ ہے بے زار یاالٰہی!

یہ ماجرا کیا ہے؟

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے تو یہی انتظار ہوتا

کوئی گاہک آنے کا نام ہی نہیں لیتا۔

چیلا :استاد! میں ابھی آتا ہوں۔

(یہ بول کر وہ مزار کی طرف جاتا ہے اور بہت دیر کے بعد آتا ہے۔)

غالب :اوہ میرے یار! کہاں تھا اب تک؟

چیلا :وہ سامنے والے مزاروں پر گیا تھا۔ استاد! میں نے وہاں بہت عجیب سی چیز دیکھی، ایک مزار پر بہت سارے تالے تھے۔ میں نے گنا تو 81 اور ایک مزار پر بہت ساری چوڑیاں دیکھی۔ استاد! مگر یہاں تالے اور چوڑیوں کے کیا کام؟ مجھے سمجھ نہیں آیا!

غالب :اچھا،

ع: اگ رہے ہیں مزار سے تالے غالبؔ

چیلا :استاد! یہ شاعری چھوڑو! اس کی وجہ بتاؤ!

(اسی درمیان شام ہو جاتی ہے اور غالب اپنے ٹھیلا کے ساتھ مغموم اور خوش خوش واپس آجاتا ہے۔)

اگلے دن اسی مزار پر ٹھیلا لگایا مگر آج گاہکوں کی مار ہے۔ چیلا بھی پریشان آخر اتنی بکری! دراصل غالب کے ٹھیلا میں آج تربوز نہیں بلکہ چوڑیاں، تالے، پھول، اگر بتی اور چادریں تھیں۔ جو بہت ہی زیادہ بک رہی تھیں۔

☆☆☆

گو قبر میں اتارا، نہ دل سے اتار دو!

عجیب سی بے چینی ہے آنکھیں نیند کو ترس رہی ہیں، مگر نیند کو گویا ہم سے دشمنی ہو، ٹھنڈ بھی ہے۔ سارے شہر کا قافلہ سو رہے ہیں۔ میں اکیلا ہی بیدار ہوں۔ باہر سنسان قبرستان، بڑی سی مسجد، دل خوف سے پتا سا اڑا جاتا ہے، گویا۔

شام غربت ہے اور شہر خاموش ہے
خوف کی ہے گھڑی وقت ہے پر خطر

اسی خوف و ہراس کے عالم میں نہ جانے کب آنکھ لگ گئی، پتہ بھی نہیں چلا اور میں نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

اسی درمیان کیا ہوتا ہے کہ کوئی آیا اور مجھے گہری نیند سے زبردستی جگا دیا کہ: اٹھو! اور ہمارے ساتھ چلو! میں مدہوشی کے عالم میں ہی اٹھا اور بغیر ٹوپی اور چپل پہنے ہی ان کے ساتھ چلنے لگا۔ مسجد سے نکلا، تو کیا دیکھتا ہوں کہ پورے قبرستان کے مردے اپنی اپنی قبروں سے باہر نظر آرہے ہیں۔ میں بہت ڈرا، دل سہم گیا، یہ کیا؟ قریب تھا کہ میں بھاگ کر مسجد واپس آجاتا، اور سب کو جگا دیتا، مگر مجھے جگانے والا تیزی کے ساتھ میرا ہاتھ پکڑ لیتا ہے۔ میں نے کوشش بھی کی کہ اپنا ہاتھ چھڑا لوں مگر کامیاب نہ ہو سکا۔

اب وہ مجھے لے کر پورے شہر خموشاں کی سیر کرانا شروع کرتا ہے۔ سب کے بارے میں بتاتا ہے: یہ فلاں ہے۔ یہ دنیا میں ایسا کرتا تھا، یہ کرتا تھا، میں نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے ساتھ چل رہا تھا اور سب کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ کچھ خوش و خرم تھے۔ مگر اکثر پریشان، مغموم، رنجیدہ، پراگندہ، بری حالت میں تھے۔ میں نے ایسی حالت زار کبھی کسی کی نہیں دیکھی تھی۔

چلتے چلتے ہم قبرستان کے ایک کونے میں جا پہنچے، جہاں بہت سارے مردے جمع تھے۔ سب کے سب چیخ و پکار رہے تھے۔ بے حال، پریشان ایسی پریشانی ہم نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ ایسا لگتا کہ دنیا کی ساری پریشانی، مصائب و آلام ان سے پیدا ہوتے ہیں۔

وہ سارے کے سارے اسی حال میں تھے۔ مجھے جگانے والا کا مقصد، دراصل اسی جگہ لانا تھا۔

اس نے سب کو آواز دی؛ کہا : یہ دیکھو! لے آیا ہوں۔ جو کہنا ہے اس سے کہو، جو آپ بیتی سنانی ہے۔ اسے سنا دو۔

سب کے سب اچانک میری طرف متوجہ ہو گئے۔ ان کی شکل و صورت دیکھ کر، دل پھٹنے کے قریب تھا۔ پھر زبردستی مجھے ان کے درمیان بٹھا دیا گیا۔ اب باری باری سبھوں نے اپنی داستان حسرت سنانا شروع کیا۔ جسے سن کر میں بھی رویا، وہ بھی روئے، سب اپنی دنیاوی زندگی پر کفِ افسوس مل رہے تھے۔ کہ کاش اچھے اور نیک کام کر

لیئے ہوتے! تو آج جنت کے باغات میں رہتے! اس مصیبت کے شکار نہ ہوتے!

مگر ہائے رے افسوس کہ اب کیا ہوسکتا ہے!

انہی میں سے کسی نے کہا :ابھی بھی ہوسکتا ہے۔

ایک نے پوچھا :وہ کیسے؟

اس نے جواب دیا :کہ گر ہمارے رشتے دار ہمارے لے ہمیشہ ایصال ثواب کرتے رہیں۔ ہمارے لیے دعائیں کرتے رہےتو اللہ تعالیٰ کا عذاب ہم سے ختم ہوسکتا ہے۔ گر اللہ پاک نے چاہا۔ وہ دیکھو! پاس کی قبر والا پہلے عذاب میں مبتلا تھا، مگر اس کا بیٹا حافظ و عالم ہے وہ ان کے لیے دعائیں کرتا ہے۔ اسی کے پاس والی عورت کہ پہلے عذاب میں مبتلا تھی۔ اب آرام میں ہے، وجہ اس کا بیٹا اس کے لیے ایصال ثواب کرتا رہا، عمل خیر کا ثواب بھیجتا رہا، جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے اس کے عذاب کو دور کر دیا۔ وہ مشہور واقعہ ہے نا، کہ باپ کو بخش دیا جاتا ہے۔ اس کے بچے کے صرف **بسم الله الرّحمن الرحيم** پڑھنے پر۔

میں ان کی باتیں بڑے غور سے سن رہا تھا۔

اسی درمیان ان میں سے ایک نے پوچھا :کیا واقعی ہمارے رشتے داروں اور مومنین کی دعاؤں سے ہماری مغفرت ہوسکتی ہے؟

میں نے جواب دیا :ہاں، زندوں کے ایصال ثواب سے مردوں کو فائدہ ہوتا ہے اور یہ احادیث مبارکہ اور بزرگان دین کے واقعات سے ثابت بھی ہے۔ یہ سوال پوچھنے والا دراصل وہابی کا فریب خوردہ تھا۔ میں نے کہا حدیث میں ہے

> ”جب انسان مر جاتا ہے۔ تو تین اعمال کے علاوہ اس کے سارے اعمال منقطع ہوجاتے ہیں (۱) صدقہ جاریہ (۲) وہ علم جس سے نفع اٹھایا جات ہے۔ (۳) نیک اولاد جو اس کے لیے دعا کرے۔“ (مسلم)

''انہیں اس کا ثواب پہنچتا ہے اور اس سے ایسے ہی خوش ہوتے ہیں۔ جیسے تم میں سے کوئی شخص تحفے سے خوش ہوتا ہے''۔ (عمدة القاری)

ان باتوں کو سننے کے بعد سارے مردے بہت مایوس ہو گئے، میں نے پوچھا کیوں ایسا؟

ان میں سے ایک نے بولا : میں نے اپنی اولاد کے لیے لاکھوں کی جائیداد چھوڑی ہے بہت کچھ ان کے لیے کیا، مگر آج وہ ہمارے لے کچھ بھی نہیں کرتے، بلکہ اب بیٹا ایصال ثواب کو نا جائز وغیرہ کہنا شروع کر دیا ہے۔

ایک نے سنایا : کہ میں غریب تھا۔ میری کئی بیٹیاں تھیں۔ ان کی شادی کے لیے میں نے بہت محنت کی اور سب کی شادی کرائی۔ ان کو ہر خوشی دی، کسی چیز میں کمی نہ کی، مگر ان بیٹیوں میں سے اب مجھے کوئی یاد نہیں کرتی ہے۔ میرے لے کچھ نہیں بھیجتی ہے۔ حالانکہ مجھے ان کے صدقہ وخیرات اور دعاؤں کی بہت سخت ضرورت ہے۔ کیوں کہ اب میں عمل نہیں کر سکتا ہوں۔ مگر افسوس صد افسوس مجھے سب بھول گئے۔ قبر تک نہیں آتے ہیں۔

ایک بولا : میں اپنے وقت کا بڑا پہلوان تھا۔ لوگ میرے نام ہی سے کانپ جاتے تھے۔ مگر اب میں بری حالت میں ہوں۔ میرے بیوی بچے بھی مجھے یاد نہیں کرتے۔ ایصال ثواب تو بہت دور کی بات ہے۔ جبکہ زندگی میں میں نیان کی راحت وسکون میں کوئی کسر باقی نہ رکھی تھی۔ افسوس! کچھ آخرت کے لیے کر لیا ہوتے تو یہ حال نہ ہوتا۔

اسی طرح ہر کوئی اپنے دکھ درد کا اظہار کر رہا تھا ہر ایک ہی کی بس ایک ہی تمنا تھی۔ ہم نے دنیا میں چاہے جو کچھ بھی کیا۔ مگر کیوں کہ اب ہم دوبارہ دنیا میں واپس نہیں جا سکتے کہ نیک اعمال کریں۔ بس اب ہماری اولاد، رشتے داروں سے ہی کہہ دو، کہ وہ ہمارے لیے زیادہ سے زیادہ ایصال ثواب کریں ویسے بھی اب شب براءت قریب ہے۔ ہمارے احباب و رشتے داروں کو کہہ دینا کہ وہ ہمارے لیے زیادہ سے زیادہ ایصال ثواب کریں۔ ہمارے بارے میں سوچیں ہمیں نہ بھول جائیں کیوں کہ زندگی میں ہم نے ان کی خاطر بہت کچھ کیا ہے۔

مجھے لے جانے والے اب سب کو منع کرتا ہے، کہ بس ہو گیا۔ اب ان کو جانے دو۔ یہ تمہاری باتیں تمھارا درد

سب تک پہنچا دے گا۔ میں نے بھی اثبات میں سر ہلایا اور دونوں واپس آنے لگے۔ ان کے دکھ درد کو سن کر دلِ بسمل کی طرح تڑپ رہا تھا۔ اندھیرا گھر، اکیلی جاں، دم گھٹتا، دل اکتاتا، کہ یہ لوگ کیسے رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سب پر رحمت کی نظر فرمائے۔

وہ مجھے مسجد تک چھوڑ گیا۔ تبھی کانوں میں آذان کی صدا گونجی: اللہ اکبر۔ اچانک آنکھ کھلی، خود کو مسجد میں دیکھ کر، دنگ رہ گیا، جسم میں کپکپی تھی، دل دھڑک رہا تھا کہ یہ کیسا خواب تھا۔

☆☆☆

آج میرا مدنی قافلہ، ایک ایسی مسجد میں ہے۔ جس کے آس پاس قبرستان واقع ہے۔ یہ شہرِ خموشاں کے بیچ و بیچ مسجد ذرا الگ ہی معلوم ہو رہی ہے۔ مسجد سے باہر نکلیں تو قبور ہی استقبال کے لیے کھڑے ہیں۔ ان کو دیکھ کر دل پریشان سا ہو جاتا ہے۔ دل بے چارہ پریشان ہے کہ آخر ہم قبرستان میں ہیں یا مسجد میں۔

ان قبروں کو دیکھ کر ماضی بھی یاد آیا کہ ماضی قریب میں ہمارے کچھ لوگ بھی اسی شہرِ خموشاں میں جا بسے ہیں۔ ؎

ہمیں بے چین و بے قرار چھوڑ کر
ہماری آنکھوں میں اشکوں کا دریا چھوڑ کر

ان قبروں کو دیکھ کر ایک چیز سمجھ آئی سب ایک ہی ساتھ رہ رہے ہیں کوئی امیر، غریب کا فرق نظر نہیں آتا۔ یعنی ؎

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا نہ کوئی بندہ نواز

اچھا کچھ لوگ دنیا کے مصائب آلام کو دیکھ کر قبرستان کا مسافر بننا چاہتے ہیں۔ مگر قبر والوں سے گر پوچھا جائے تو ان کا جواب کیا ہوگا کہ وہ واپس دنیا میں آنا چاہتے ہیں یا نہیں۔ مجھے نہیں معلوم۔

☆☆☆

دنیا میں کتنا غم ہے

کبھی کبھی ہمیں لگتا ہے، ہم بہت پریشان ہیں، ہماری قسمت میں دکھ ہی دکھ ہے۔
لیکن جب دوسروں کے بارے میں سنتا ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ، مجھ پر اللہ تعالیٰ کا احسان عظیم ہے۔
ابھی حال ہی میں میرے ایک پیارے مخلص دوست نے ایک ایسی بچی کا ذکر کیا جس کی ابھی کچھ دنوں پہلے

شادی ہوئی مگر شادی میں نہ تو ان کے والد موجود تھے، نا ہی والدہ۔اس بچی کا دل ونظر والدین کو کتنا تلاش کرتا ہوگا نا!

دراصل ان کے والدین کچھ دنوں پہلے دنیا سے چل بسے۔ان کے انتقال کا واقعہ بھی بہت عجیب ہے۔کچھ دنوں پہلے ایک کا انتقال اوراس کے انتقال کے کچھ ہی دنوں کے بعد دوسرے کا۔

اسی طرح ایک واقعہ ابھی حال ہی میں پیش آیا، کچھ سال پہلے ماں اکسیڈنٹ سے انتقال ہوئی اور ابھی باپ بھی اکسیڈنٹ سے انتقال ہوگیا۔

اب ان کے بچے کیسے رہیں گے!ان کا کیا حال ہوگا!وہ کتنے غمگین ہوں گے!ان کی زندگی میں یہ کیسی عجیب گھڑی ہوگی نا!۔

پیار کہتے ہیں کسے اور مامتا کیا چیز ہے کوئی
ان بچوں سے پوچھے جن کی مرجاتی ہے ماں

☆☆☆

بھیا میرے لیے دعا کیجیے گا

میں جب بھی سفر کرتا، اکثر چھوٹا بھائی مجھے چھوڑنے ریلوے اسٹیشن آجاتا۔ مجھے چھوڑتا اور کچھ باتیں کر کے واپس چلا جاتا۔کبھی کبھی کچھ زیادہ دیر رکتا تھا۔مگراس بار کچھ الگ ہی ہوا۔وہ مجھے بس اسٹاپ پر چھوڑنے آیا۔بس ذرا تاخیر سے کھلنے والی تھی۔بس کے باہر وہ مجھ سے باتیں کرنا شروع کیا اور بہت دیر تک بہت ساری باتیں کی:اپنوں کی دشمنی،اپنی پریشانی اور مستقبل کی پلاننگ، وغیرہ وغیرہ۔دراصل کچھ دنون سے وہ مجھ سے ناراض تھا۔

آج دل کھول کر وہ مجھ سے باتیں کر رہا تھا۔شروع سے میں باہر رہا ہوں اور وہ گھر ہی میں،اسی وجہ سے گھر کے مسائل وہ مجھ سے زیادہ جانتا تھا۔مجھ سے اس نے معافی بھی مانگی اور دعا بھی کرنے کہا۔مگر میں کسی اور وجہ سے اندر سے بہت ٹوٹا ہوا تھا۔میرا دل زیادہ باتیں کرنے کا بالکل بھی نہ تھا۔اسی وجہ سے میں زیادہ سنتا ہی رہا اور وہ بولتا ہی رہا۔وہ مجھ سے باتیں کرتا ہی جارہا تھا۔میں نے کئی ایک بار کہا ’’اب تم چلے جاؤ‘‘

میرے پاس چینج پیسے نہیں تھے۔وہ مجھے کہیں سے لاکر دیا اور کھانے کا سامان بھی دیا۔میں نے منع بھی کیا مگر نہیں مانا۔آج وہ بہت ہی شاید خوش تھا۔اس نے مجھ سے بہت ساری باتیں کی۔میں کھڑے کھڑے سنتا رہا اس نے اپنی بیماری کا ذکر کیا، میں نے کہا کہ ’’ہاں جلد ہی اس کا علاج کروانا ہے‘‘۔

اس نے بہت ساری باتیں کی۔میں سمجھ نہیں پایا کیوں اتنی باتیں یہ مجھ سے کر رہا ہے۔خیر تقریباً گھنٹہ بھر بات

کر کے۔وہ مجھ سے رخصت ہوا۔

یہ ہم دونوں بھائی کی آخری ملاقات تھی۔پھر میں نے اسے کفن میں لپٹا ہوا دیکھا۔بھائی! کیوں آج تو بہت سکون سے سو رہا ہے! جبکہ تجھے تو رات کو بہت کم نیند آتی تھی! تو بہت پریشان رہتا تھا! آج بہت پرسکون ہے! بھائی! میں تیرے پاس ہی سوتا تھا۔جب تو رات کو اٹھ کر بیٹھا رہتا۔تو میری آنکھیں کھل جاتی تھی۔میں بھی تیرے پاس بیٹھا رہتا تھا۔کبھی تیرے سر پر ہاتھ پھیرتا۔

تو مجھ سے کتنی باتیں کرتا تھا مگر آج تو بالکل خاموش ہے۔بھائی! تو بول کیوں نہیں رہا ہے! یہ دیکھ! تیرا یہ بھائی بہت دور سے تجھے دیکھنے آیا ہے۔ذرا دیکھ تو بہت دور سے تجھے دیکھنے آیا ہوں۔

میں جب گھر پہنچا تھا۔وہ عین جمعہ کی نماز کا وقت تھا۔اور جنازہ گھر سے باہر روڈ میں رکھ دیا گیا تھا۔

جمعہ کی نماز کے بعد قبرستان گیا اور اپنے ہاتھوں سے اپنے ہر دل عزیز بھائی کو قبر میں اتار دیا۔بھائی تجھے یاد ہے تو نے مجھے بہت کچھ سکھایا تھا۔گھڑی میں ٹائم دیکھنا تو نے ہی سکھایا تھا۔تو مجھے چھوڑنے ریلوے اسٹیشن جاتا تھا۔آج میں تجھے ایسی جگہ چھوڑ رہا ہوں جہاں سے تو کبھی واپس نہیں آئے گا۔تو سوچا نہیں بھائی! کہ ہم لوگ کیسے رہیں گے! کیسے جئیں گے! ابھی تو چند سال پہلے امی انتقال ہوئی اب تو بھی ہمیں چھوڑ گیا۔

☆☆☆

سر درد

میں ایک کپڑے کی دوکان میں بیٹھا ہوں۔احباب کپڑے پسند کر رہے ہیں جبکہ میں ایک کرسی پر بیٹھا لکھ رہا ہوں۔

دراصل ہم لوگ آج مغرب بعد انعامات کی چیزیں لینے کے لیے مارکیٹ آئیں ہوئے ہیں۔پہلے کتابیں خریدی،اب عمامے خریدنے یہاں آئے ہیں۔

مگر میرے سر میں ایک عجیب قسم کا درد ہو رہا ہے۔بالکل بے چینی لگ رہی ہے۔چکر بھی آ رہا ہے۔

انسان کے جسمانی ساخت کتنی عجیب سی ہے نا! کہ اس کا جسم صحیح،طبیعت صحیح،تو دنیا صحیح،نہیں تو دنیا عجیب سی لگتی۔

سر درد بھی ایک عجیب چیز ہے نا۔کیوں کہ ہمارے جسم کا پورا کنٹرولر سر ہی ہوتا ہے۔اب اگر اس میں درد ہو۔تو آدمی کیا کر سکتا ہے۔

میں کرسی پر بیٹھا ہی ہوں۔احباب کپڑے دیکھنے کے لیے بول رہے ہیں۔مگر میرا دل نہیں کرتا ہے۔
اس کے باوجود میں لکھ رہا ہوں۔کیوں کہ اس سے میرا غم ہلکا ہوتا ہے۔

☆☆☆

بوڑھا اور نقاب پوش

سفر میں کبھی کبھی کچھ ایسے مناظر دکھ جاتے ہیں۔جو بھولے نہیں جاتے۔

ایک بار ٹرین کے سفر میں ایک چھوٹا لڑکا اپنا ہاتھ کھڑکی سے باہر نکالا ہوا تھا۔نا جانے کونسی چیز سے ٹکرایا، پورا ہاتھ چمڑی میں لٹ گیا۔جس وقت یہ سانحہ پیش آیا۔ٹرین اپنی پوری رفتار میں تھی۔یہ چیز اتنی برق رفتاری سے ہوئی کہ کسی کو کچھ سمجھ نہیں آیا کہ کیا ہوا! میں دوسرے سائڈ کی کھڑکی کے پاس بیٹھا تھا۔مجھے بہت تیز آواز آئی۔مجھے لگا کہ شاید یا تو کسی نے پتھر مارا، یا ٹرین پٹری سے اتر چکی ہے۔

جس بچے کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا تھا۔اس کو بھی پتہ نہیں چلا کہ اچانک کیا سے کیا ہو گیا! کچھ دیر کے بعد اس نے اپنے ہاتھ کو نکالا تو پورا ہاتھ قیمہ بن چکا تھا صرف چمڑے میں ٹکا ہوا تھا۔میں نے یہ منظر پھر کبھی نہیں بھولا۔

ابھی بائک سے آرہا تھا کہ ایک نقاب پوش اور ایک بوڑھا روڈ کے کنارے سے کچھ چن رہے تھے۔بعد میں معلوم ہوا کہ وہ پھینکی ہوئیں سبزی اٹھا رہے تھے۔

اللہ اکبر! اتنا بڑا مالدار شہر (حیدرآباد)، جس میں جنازے کم شادیاں زیادہ ہوتی ہیں۔لاکھوں روپیے خرچ ہوتے ہیں مگر افسوس! افسوس! افسوس!۔

☆☆☆

آ گئی نا پھر تمھیں نیند، عجیب شخص ہو، سفر بھی کرتے ہو اور آرام بھی

میں ابھی بس میں بیٹھا ہوں۔جڑ چلا (ضلع محبوب نگر، تلنگانہ) جا رہا ہوں۔دراصل جڑ چلا میں دعوت اسلامی کا دو دن کا اجتماع ہے۔ہمارے جامعہ سے دو بسیں جا رہی ہیں تقریباً سارے اساتذہ کرام اور طلبہ کرام موجود ہیں۔

میں جس بس میں بیٹھا ہوں اس میں ہمارے ناظم صاحب، قاری صاحب اور میرے پاس فراز بھائی ہیں۔

مجھے ان پے بہت غصّہ آرہا ہے۔ایک تو بڑے نخرے دیکھا دیکھا کر تیار ہوا اور اب بس میں بیٹھے بیٹھے سو رہا

ہے۔میں اکیلا ہی چپ چاپ بیٹھا ہوں۔دراصل ہم دونوں میں ذرا بے تکلفی ہے۔
حسنِ اتفاق سے ہم دونوں کا نام بھی فیض وفراز ہے اور اس نام کے دو بہت بڑے شاعر ماضی قریب میں گزرے ہیں۔
ہم دونوں میں کافی فکری لحاظ سے اتحاد ہے۔بہت ساری چیزیں ہم دونوں مل کرتے ہیں۔
لیکن ابھی دل کرتا ہے اس کو دھکا دے کر جگا دوں۔میں اکیلا بور ہور ہا ہوں۔
ہم انسان بھی نا،عجیب مخلوق ہیں۔تنہائی اور خاموشی ہمیں زیادہ دیر نہیں برداشت نہیں ہوتی۔
میرا دل بات کرنے کا کر رہا ہے مگر رے! فراز تیری نیند! جب کہ پاس کی سیٹ میں قاری صاحب اور ناظم صاحب ہیں وہ باتیں کر رہے ہیں۔
ایک ہمارے دشمن ہیں۔اس سفر میں وہ مجھ سے الگ ہیں۔وہ دوسری بس میں بیٹھے ہیں؟ یا سور ہیں؟ یا جاگ رہے ہیں؟ پتہ نہیں۔دراصل اب وہ بڑوں کی صحبت میں بیٹھنا پسند کرتے ہیں۔
بس میں نعتیں چل رہی ہیں مگر میرا دل بات کرنے کا کر رہا ہے مگر فراز مست سو رہا ہے۔کبھی کروٹ بدل رہا ہے۔یعنی وقفہ کر کر کے نیند کا لطف اٹھا رہا ہے۔نیند بھی کیا محبوبہ ہے نا۔کہ اس کی خاطر لوگ بہت کچھ چھوڑ دیتے ہیں۔
شاید اسی وجہ سے نینداور محبوبہ کا تعلق بہت زیادہ ہے کیوں کہ دونوں کا تعلق بہت حد تک رات سے ہوتی ہے۔
شاعر کہتا ہے:

ع: تمھیں بھی نیند سی آنی لگی ہے تھک گئے ہم بھی

چلو ہم آج یہ قصہ ادھورا چھوڑ دیتے ہیں۔

☆☆☆

ہم خیال،ہم مزاج

دنیا میں مختلف مزاج کے لوگ رہتے ہیں۔ان کے خیالات،نظریات الگ الگ ہوتے ہیں۔
اس کے باوجود اس میں کچھ لوگ ایسے بھی پائے جاتے ہیں۔جو باہم ہم خیال و ہم مزاج ہوتے ہیں۔خوش قسمتی سے کسی کسی کو ایسے لوگ مل جاتے ہیں۔چاہے وہ شریک حیات کی شکل میں ہو،یا دوست کی شکل میں،یا کسی اور شکل میں۔ایسے لوگ گر کسی ادارے کو خوش قسمتی سے مل جائیں تو وہ ادارہ بہت حد تک ترقی کر سکتا ہے۔

اس کے برخلاف گر ہم مزاجی یا ہم خیالی نہ ہو تو بہت آزمائش ہوتی ہے۔ میرے خیال سے طلاق، دشمنی وغیرہ میں اس کا بہت بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ گر بدقسمتی سے کسی ادارے کو ایسے لوگ مل جائیں تو یہ اس ادارے کی ترقی کے لیے بہت بڑی رکاوٹ ہوتی ہے۔ جس کی وجہ سے وہ ادارہ تنزلی کا شکار بھی ہوسکتا ہے۔

زندگی میں کسی ہم خیال کا ہونا بہت ضروری ہے، تاکہ وہ اس سے دل کی باتیں کر سکے اور فکری اتحاد کے ساتھ نتیجہ خیز کام کا آغاز کر سکے۔ ہمارے ایک ساتھی ہیں۔ جو بہت بڑے عہدے پر فائز ہیں۔ جب وہ بہت زیادہ پریشان ہو جاتے ہیں۔ تو مجھ سے باتیں کرتے ہیں اور غم ہلکا کرتے ہیں۔ کیوں کہ وہ جس ترقی کے حصول کی کوشش کر رہا ہے اس میں کوئی اس کا فکری دوست نہیں ہے۔ سوائے میرے کیوں کہ ہم دونوں میں کافی فکری اتحاد ہے۔

☆☆☆

کون کہتا ہے تیری یاد سے بے خبر ہوں میں

آنکھ کھلی میں اٹھا بے اختیار اس کی طرف ہاتھ بڑھا۔ ارے! کہاں چلی گئی! میں بے چین ہو گیا۔ دل دھک دھک کرنے لگا۔ وہ سوتے وقت تو میرے ساتھ لپٹ کر سوئی تھی۔ میں سیٹ سے نیچے آیا۔ ڈبے میں تلاش کیا۔ گویا عزیز بچے کو ماں جس طرح تلاش کرے یہی حال میرا ہو گیا۔ مگر وہ نہیں ملی۔ میں آس پاس بیٹھے لوگوں سے بھی پوچھا۔ وہ بھی بتا نہیں سکے۔ ہائے افسوس! وہ کہاں چلی گئی ہے! اسے کون لے گیا! دل کرتا ہے، ابھی سارے ڈبوں میں جا جا کر ایک ایک سے اس کے بارے میں پوچھوں۔ سب کا سامان دیکھوں۔ جہاں جہاں ٹرین رکی ہے۔ وہاں وہاں کا چپہ چپہ چھان دوں۔ مگر میں کیا کر سکتا ہوں! میں اکیلا ہوں۔ یہاں کوئی اپنا نہیں ہے۔ گر میں اس کی تلاش میں جاتا ہوں۔ تو سامان کی حفاظت کون کرے گا! گر چہ یہاں بہت سارے لوگ ہیں۔ مگر یہ غیر ہیں اپنے نہیں ہونے والے۔

ادھر ادھر ہاتھ پیر مارنے کے باوجود جب ناکامی ہی ہاتھ آئی تو کسی شکست خوردہ بادشاہ کی طرح رنجیدہ، کف افسوس ملتا ہوا، اپنی سیٹ میں چپ چاپ بیٹھ گیا۔ تبھی شدت سے اس کی پھر یاد آنی لگی اور میرے آنسو پلکوں کی حد کو توڑ کر ہاتھوں پہ آگرا۔ اوہ! افسوس! ع: اک اشک میرے صبر کی توہین کر گیا

وہ آنسو میرے ہاتھ پر آگرے میں نے ان آنسوؤں کو دیکھا اور کہا اے آنسو! تو ایسی جگہ گرا ہے جو اس کی جگہ تھی۔ اب تو ہاتھوں نے بھی آنسوؤں کے دریا بہا دیئے۔ پھر چپکے سے تیری یاد آ گئی، پھر تیرا تصور بے قرار کر گیا۔

یہ یک طرفہ نہیں ہے۔ اسے بھی میری بہت یاد آتی ہوگی۔ وہ بھی ماہی بے آب کی طرح تڑپتی ہوگی۔ مگر منحوس

چور اس کو زبردستی بہت دور لے جا رہا ہوگا۔ وہ بھی کہتی ہوگی۔ ؎

هـوای مـع الـركـب اليـمـانين مصعد

جـنـيـب و جثـمـانـي بـمـكة مـوثـق

مگر میں خوب جانتا ہوں۔ وہ مجبور ہے۔ بے وفا نہیں۔ گر اسے اختیار ہوتا تو زمین چیر کر میرے پاس آ جاتی۔
خیر میں اس منحوس چور کو بروز قیامت ضرور دیکھنا چاہتا ہوں۔ جس نے میری محبوبہ موبائل کو چرا کر لے گیا اور ہم دونوں کو ہجر کی مصیبت میں میں ڈال دیا۔ ؎

ملنا تھا اتفاق ،بچھڑنا نصیب تھا
وہ اتنی دور ہوگیا جتنا قریب تھا

☆☆☆

ایسی چنگاری بھی ہے، اپنی خاکستر میں

آج رات جلدی ہی سو گیا تھا۔ تین بجے کے آس پاس اپنے آپ آنکھ کھلی، بہت دیر تک نہیں نیند نہیں آئی، نیند کا بھی عجیب مسئلہ ہے۔ ٹوٹنے کے بعد واپس لانا، ہاتھی کو پاجامہ پہنانے کے برابر ہے۔
جب کافی دیر تک نیند نہیں آئی، تو میں مجبوراً اپنے بستر سے اٹھا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ کمروں کا جائزہ لیا تو سارے بچے گھوڑا بیچ کر سو رہے تھے۔ اس وقت نیند پر مجھے بہت غصہ آیا کہ تجھ کو میرے ساتھ ہی دشمنی ہے۔ پہلے اپنی عادت ڈلوایا اور اب رخ پھیر لیا۔

ع: اب رخ کو چھپا بیٹھے کر کے مجھے دیوانہ

؎

عادتیں ڈال کر اپنی توجہ کی
اک دم جو بدلتے ہیں ستم کرتے ہیں

گھومتے گھومتے جب میں آخری فلور میں پہنچا، تو مجھے محسوس ہوا کہ شاید کوئی اوپر نماز ہال میں ہے۔ میں تھوڑا سا ڈر گیا کہ ابھی اتنی رات کو کون ہوگا! کہیں کچھ اور تو نہیں۔ خیر میں ہمت کر کے اوپر گیا۔ تو میں اور زیادہ ہی ڈر گیا۔ کیوں کہ کوئی سفید چادر اوڑھے ہل رہا تھا۔ میں نے دل میں کہا: یا رب ایسی چنگاری بھی ہے۔ ہمارے جامعہ میں۔ مگر اچانک خوف نے مجھے گھیر لیا کہ یہ کوئی دوسری مخلوق بھی ہوسکتی ہے۔ لہذا پاس مت جانا ورنہ۔۔۔۔۔۔

مگر ضد ہم نے بھی سیکھ لی ہے۔ میں نے کچھ اوراد و ظائف پڑھے اور آہستہ آہستہ آگے پڑھا۔ ڈر بھی لگتا تھا مگر پھر بھی بناوٹی ہمت و جرأت کے ساتھ آگے بڑھ گیا مگر پیچھے کا راستہ بھی دیکھتا رہا تا کہ بھاگنے میں کوئی دقت نہ ہو۔

بالآخر میں بالکل قریب پہنچ گیا۔ تبھی کانوں میں اچانک صدا آئی۔ "**السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ**" استاد صاحب۔ میں نہایت ہی خوش ہوا، کہ ماشاءاللہ جنات بھی میرا شاگرد بن چکا ہے۔ جب چہرا دیکھا تو سارا ڈر، ساری خوش فہمیاں دور ہوگی کیوں کہ وہ اسی جامعہ کا ایک طالب علم تھا۔

میں نے کہا : کیوں بھائی! اتنی رات کو آپ کیا کر رہے ہیں؟ کوئی وظیفہ تو نہیں پڑھ رہے ہیں

طالبِ علم :نہیں استاد۔ امتحان کی تیاری کر رہا ہوں۔

میں نے کہا :اچھا! آپ تو ایسے نہیں تھے پہلے!

طالبِ علم :ہاں استاد صاحب. میں اتنا محنتی ہرگز کبھی نہ تھا۔

اسی درمیان میں نے اشارہ کیا، ''چلو بیٹھ جاؤ''، ہم دونوں بیٹھ گئے۔ پھر باتیں شروع ہوئی۔

میں نے پوچھا : کہ آپ اتنی رات تک کیوں پڑھ رہے ہیں؟

طالبِ علم :استاد؛ میں سونے گیا تھا۔ مگر بہت دیر تک نیند نہیں آئی۔ تو میں نے سوچا وقت کو برباد کر کے کیا فائدہ۔ چلو پڑھتے ہیں۔ کیوں کہ ہمارے اساتذہ کرام ہماری بہتری کی خاطر اتنی کوششیں کر رہے ہیں۔ کلاس کے ٹائم میں اس چیز کو بالکل بھی ماننے کو تیار نہیں تھا۔ مگر جب سے تیاری شروع ہوئی تو مجھے احساس ہوا۔ اساتذہ کرام کی نصیحت۔ بار بار ہمیں احساس دلانا اور بالخصوص ایک نظام الاوقات کے ماتحت ہمیں اپنے چھوٹے بچوں کی طرح نگرانی کر کے تیاری کا ذہن دینا۔ تضیع وقت پر ڈانٹنا۔ ہمیں ہر جگہ احساس دلانا، ہمیں ہمت دینا، ہمیشہ ہماری نگرانی کرنا، ہماری بہتری اور بہترین مستقبل کی تشکیل کے لیے کوششیں کرنا۔ اب ہمیں احساس ہو گیا۔ کہ ہمارے اساتذہ کرام ہمارے کتنے خیر خواہ ہیں۔ کیوں کہ اس دنیا میں صرف دو ہی ایسے لوگ ہیں۔ جو کسی اور کی اپنے سے بڑھ کر ترقی چاہتے ہیں۔ ایک استاد، دوسرے ماں باپ، ورنہ یہ حسد کا زمانہ۔

یہ باتیں کرتے ہوئے وہ نہایت ہی جذباتی ہو گیا اور رونے لگا۔ میں نے اس کو تسلی دی۔

وہ بولا :استاد صاحب! مجھے بہت دیر سے سمجھ آیا، ورنہ میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ وقت گزاری میں، اپنا پورا سال گزار دیا۔

میں نے کہا :ان کی چکر میں مت رہنا ''یہ ترے غیر ہیں اپنے نہیں ہونے والے''۔

اب وہ اور بھی رونے لگا۔

میں نے کہا :چلو، اچھی بات ہے۔اب بھی اگر تمھارے اندر احساس پیدا ہو گیا، تو الحمدللہ۔ابھی بھی بہت وقت ہے۔اس میں خوب محنت کرو اور اپنے ماں باپ کی تمناؤں کو یاد کرو۔جب میں نے یہ بات کہی۔تو گویا اس کو سخت چھوٹ لگی، اور بے قرار ہو گیا۔میں سمجھ گیا اور پوچھ لیا، کہ تمہارے ابو کیا کرتے ہیں؟

وہ رو کر جواب دیا،

طالبِ علم :''وہ نہیں ہیں'' میں بہت چھوٹا تھا۔جب وہ انتقال کر گے۔ہاں؛ لیکن میں نے اپنے رشتے داروں سے سنا ہے کہ وہ مجھے بہترین عالم دین بنانا چاہتے تھے۔

میں نے کہا :اللہ تعالیٰ ان کو جنت میں اعلی مقام عطا فرمائے اس کے آنسوؤں کو دیکھ کر میں بھی آبدیدہ ہو گیا۔ اچھا چلو! اب تم ان کی اسی تمنا کو پورا کرنے کے لیے دن رات محنت کرو! خوب کوشش کرو! کیوں کہ کوشش کرنے والو کی کبھی ہار نہیں ہوتی۔

اس نے باتوں

باتوں میں کہا :کہ ابھی بھی کچھ ایسے بچے ہیں، جو اپنے اساتذہ کرام کی محنت کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔

میں بولا :انشاءاللہ تعالیٰ رب کی رحمت پر پورا یقین ہے وہ بھی سمجھ جائیں گے۔ہم نا امید نہیں ہیں۔ہم ان کے لیے ہمیشہ جی توڑ محنت کریں گے۔ان کے حق میں بہتری کی دعا کرتے ہیں۔ ؎

کر لے کچھ تو اب پڑھائی
ورنہ ہوگی بڑی رسوائی

اسی درمیان میری نظر گھڑی پر پڑی، تو چار بج رہے تھے۔اب مجھے نیند آرہی تھی۔چلو! اب سو جاتے ہیں۔

اس نے کہا :استاد صاحب؛ آپ کا بہت بہت شکریہ، آپ جائیں، مجھے پڑھنا ہے اور اپنے والدین، اساتذہ

کرام اور جامعہ کا نام بلند کرنا ہے۔ دین کی خاطر اور دعوت اسلامی کی خاطر بہت کچھ کرنا ہے۔
میں اس کو کامیابی کی دعا دیتے ہوئے واپس کمرے میں آیا۔ اور سو یا گیا۔ فجر کی نماز میں اس طالب علم کو پہلی صف میں دیکھا۔ تو میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرایا میں اسے دیکھ۔
اللہ تعالیٰ ایسے بچوں کو سلامت رکھے۔ امین

☆☆☆

سفر

ویسے گر دیکھا جائے تو ہماری زندگی ایک سفر ہی ہے۔
جس میں کوئی ساتھی چاہیے ورنہ انسان اکیلا ہی اکیلا رہ کر بور ہو جائے گا۔ ویسے بھی اکیلے کوئی چیز برداشت کرنا اتنا آسان نہیں ہوتا، ہم سب کو اپنے اسکول کا زمانہ یاد ہوگا۔ جس دن سب کو ایک ساتھ ڈانٹ پڑتی تھی یا مرغا بنایا جاتا تھا تو اتنی زیادہ تکلیف نہیں ہوتی تھی۔ کیوں کہ سب شامل رہتے تھے، بلکہ بسا اوقات تو اچھا بھی لگتا تھا اور مزا بھی آتا تھا۔ اس کے برخلاف گر ڈانٹ اکیلے سب سے سامنے پڑ جائے، تو اس وقت کتنی رسوائی و شرمندگی اٹھانی ہوتی تھی۔ یہ ہر کوئی اچھی طرح محسوس کر سکتا ہے۔
اسی طرح گر آپ سفر میں ہیں، چاہے دین کا سفر ہو، چاہے دنیا کا، چاہے بس کا یا ٹرین کا یا کسی اور کا، گر آپ اکیلے ہیں، تو آپ کو اچھا نہیں لگے گا عجیب محسوس ہوگا۔ یہی اکثریت کا حال ہے۔
میرے خیال میں اسی وجہ سے ایک انسان کی زندگی میں رشتے دار، دوست وغیرہ کا ہونا ضروری ہے۔ تاکہ خوشی آئے تو مل کر خوش ہوں اور خوشی عام و تام ہو اور اسی طرح غم آئے تو انسان اکیلا نہ ہو کوئی ساتھ ہو۔ تاکہ بوجھ کم ہو اور ہلکا ہو۔

☆☆☆

میں خوش نصیب ہوں یا بدنصیب

بیٹی! ابھی میرے سر میں بہت زیادہ درد ہو رہا ہے۔ میں ذرا پریشان ہوں۔
بیٹی! یہ دنیا جس میں تو ابھی ابھی آئی ہے، بہت عجیب ہے۔ معلوم ہے تجھے، تو دنیا میں آئی اور مجھے تیری پیدائش

سے صرف آدھا گھنٹا پہلے خبر دی گئی۔ فی الحال میں تجھ سے بہت دور ہوں مگر تو میرے دل کے قریب ہے۔
پتہ ہے بیٹی! میں نے تیرا نام نور جہاں رکھا ہے، کیوں کہ تو میرے گھر کی پہلی روشنی ہے۔ تو کتنی اچھی ہے! کتنی پیاری! کتنی سہانی! مگر تجھے پتہ ہے بیٹی! میرے اپنے ہی لوگوں نے ہم دونوں کے درمیان کتنی نفرت پھیلا دی ہے۔ اتنی نفرت، کہ تجھ کو میرے گھر لانے کے لیے تیرے دادا دادی نے جی توڑ کوشش کی، مگر تیرے اپنے ہی کچھ لوگوں نے تجھے اپنے گھر آنے نہیں دیا۔ بیٹی! تیرا نام نور جہاں یعنی دنیا کی روشنی ہے۔ مگر تجھے معلوم ہے؟ تیرے اپنے ہی رشتے دار کتنی جہالت کے اندھیرے میں پڑے ہیں۔

بیٹی! مجھے تری بہت یاد آتی ہے۔ تو میری پہلی بہار ہے۔ مگر میں کیا کر سکتا ہوں میں تجھ سے بہت دور ہوں۔ پھر تمہارے اپنوں نے ہم باپ بیٹی کے درمیان ابھی سے ہی نفرت کی دیوار ڈال دی ہے۔ کتنی آرزو ہیں بیٹی! مگر ظالموں نے کتنا ظلم کیا ہے ہم لوگوں پر، اور ہم دونوں کو ایک دوسرے سے ملنے کا موقع نہیں دیا۔

بیٹی! میں تجھے اپنے ہاتھوں سے کھیلانا چاہتا ہوں۔ تجھے اپنے سینے سے لگا کر تیری محبّت والفت کو اپنے دل میں بسانا چاہتا ہوں۔ تجھ سے بہت ساری باتیں کرنی ہے۔ کہ کچھ لوگوں نے ہمیں کتنا تنگ و پریشان کیا ہے۔

بیٹی! تیری پیدائش سے میرے پورے گھر میں خوشی کا ماحول ہے۔ سب خوش ہیں۔ اب میں خوش نصیب ہوں یا بدنصیب نہیں معلوم۔ ویسے کہتے ہیں کہ بیٹی خوش نصیبوں کو ملتی ہے۔ مگر میں کیسے کہہ سکتا ہوں کہ تو مجھے ملی ہے۔

خیر بیٹی! ہم نے تمہاری خوشی میں ختم قادریہ بھی کرایا، تیری لمبی عمر وصحت کی خاطر۔ اللہ تعالیٰ تماری وجہ سے ہمارے درمیاں کی ناچاقیاں کو ختم کر دے اور ایک پیار ومحبت والی خوشگوار زندگی مل جائے۔

بیٹی! ہاں تجھے میں ایک بڑا اور اچھا انسان بنانے کے ساتھ ساتھ اپنی قوم کے لیے نفع بخش بناؤ گا۔

اچھا بیٹی! ابھی جب میں گھر آؤں گا تو تیرے لیے کیا کیا لانا ہے۔

ٹھیک ہے میں خود غور وفکر کر کے دنیا کی نعمتیں تیرے لیے لانے کی مقدور بھر کوشش کروں گا، ویسے تو یہ مت سمجھنا کہ تیرا باپ تیری پیدائش سے خوش نہیں ہے۔ مگر اپنوں نے بہت دکھ دیا ہے بیٹی!

☆☆☆

ہر ستم یہ سوچ کر ہم سہ گئے

دل تو کرتا ہے کہ دادی کو اٹھا کر، اوٹو سے باہر پھینک دوں۔ جب دیکھو مجھے ہی لوہے پے بٹھاتی ہے۔ بولتی ہے کہ: انیس! بیٹے، تو اچھا لڑکا ہے۔

ہاں بوڑھی دادی! میں اچھا ہوں، تو اس کا مطلب یہ تو نہیں، کہ آپ ہر بار مجھے ہی اوٹو کے لوہے پر بیٹھاؤ گی۔
انیسہ ،بھی تو ہے۔مگر آپ نے اسے گود میں بیٹھا رکھا ہے۔

انیس :اس بار میں کسی بھی حال میں نہیں بیٹھوں گا۔انسیہ کو بٹھاؤ۔

دادی :نہیں، بیٹے! انیسہ بڑی ہے نا، وہ وہاں کیسے بیٹھے گی وہاں!

انیس :دادی! دوسرے لوگ تو بٹھاتے ہیں۔میں نے بہت دیکھا ہے۔

دادی :ہاں،مگر وہ غلط کرتے ہیں۔کہ بیٹی کو وہاں بٹھاتے ہیں۔

انیس :جی ٹھیک ہے، آپ کی بات۔مگر میں نہیں بٹھتا، آپ لوگ جاؤ! شادی میں، میں نہیں جاتا۔

دادی :بیٹے،تو شریف اور فرماں بردار ہے۔اچھے لڑکے ایسی ضد نہیں کرتے۔تو ابھی بیٹھ جا اگلی بار میں کسی اور کو بٹھاتی ہوں، وعدہ۔

انیس (غصے میں) اتنی تیزی سے لوہے پر بیٹھا کہ لڑھک کر باہر ہی گر گیا۔انیس،شعلہ فشاں آنکھوں سے دادی کو دیکھا اور دل ہی دل میں دادی کو کوسا اور دوبارہ آ کر شانت سے بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ آخر کس سے کہوں؟ اس میں بیٹھنے میں جو شرمندگی ہوتی ہے۔وہ بیٹھنے والا ہی محسوس کر سکتا ہے۔یہ ایک طرح کی سفرِی سزا ہے۔پیٹھ باہر کیے رہو، آدھا جسم باہر، آدھا اندر، سب لوگ دیکھتے ہیں، یہ کون ہے؟ ایک تو لوہے پر بیٹھنا، کسی رسی پر بیٹھنے سے کم نہیں ہے، اس پر مزید پیٹھ باہر، جس سے بیرونی حملے کا خطرہ ہمیشہ لگا رہتا ہے کہ کوئی گاڑی آ کر پیچھے سے مار نہ دے۔اس پر مزید تکلیف، کہ باقی دوسرے لوگ آرام سے بیٹھے بیٹھے سفر کا لطف اٹھائیں۔اور کوئی نا کردہ گناہ کی سزا بھگتے۔

بھول سے بھی سر باہر نکال نہیں سکتا۔گر کوئی دوست دیکھ لیا، تو اگلے دن عزت کا جنازہ،مگر کیا کر سکتا ہوں جب اس درد کو اپنے ہی نا سمجھیں۔

ہاں یہ بھی بات صحیح ہے، اب ایک آدمی کے لیے الگ سے اوٹو تو نہیں کر سکتے ہیں! مگر اس میں بیٹھنے والے کو کتنی آزمائش، شرمندگی ہوتی ہے، شاید اسی وجہ سے وہ پورے سفر میں اپنے سر کو جکھائے رکھتا ہے۔

انیس کو دادی، انسیہ، امی اور ابا پر بہت غصہ آ رہا تھا۔وہ گھور گھور کر غصے سے ان کو دیکھتا تھا۔

انیس کے دماغ میں بہت ساری چیزیں گردش کر رہی تھی، اگلی بار گر مجھے بٹھایا تو میں زبردستی دادی ہی کو بٹھادوں گا، تا کہ معلوم ہے کہ کتنی تکلیف ہوتی ہے اور گڈھے آ جائیں تو کیسا جھٹکا لگتا ہے۔

تب ہی دادی نے کہا :انیس، بیٹے !اب غصہ ختم کرو اور مسکراؤ،
انیسہ ،تو انیس کو دیکھ کر پہلے ہی سے مسکرا رہی تھی۔جس کی وجہ سے انیس کا غصہ مزید بڑھ ہی رہا تھا، گھر جا کر بتاتا ہوں کہ کسی کی تکلیف پر مسکرانا، کیا ہوتا ہے۔
تبھی باہر سے کسی بائک والے نے آواز دی، او،لڑکے! ذرا جسم اندر ہی رکھو، ورنہ تمھارا جسم قبر میں چلے جائے گا۔
خیر کسی طرح شادی میں پہونچے، مگر انیس آج کے واقعات سے بہت دل برداشتہ تھا، وہ غمگین ایک کرسی پر بیٹھا اپنی روداد لکھ رہا تھا۔

شاید ان کا آخری ہو یہ ستم
ہر ستم یہ سوچ کر ہم سہ گئے
ع: سنے جاتے نہ تھے تم سے میرے دن رات کے شکوے

☆☆☆

اوٹو سے اترا، اترتے ہی گھر پر نظر پڑی، خوشی ہوئی، الحمدللہ پڑھا، من میں بولا: بڑے دنوں کے بعد گھر آیا ہوں، اب آرام کرنا ہے۔سیدھا اپنے کمرے میں آیا، بیگ ایک طرف رکھا اور ایک تھکے ماندے مسافر کی طرح بستر پر گر پڑا، گرتے ہی سکون کی نیند آ گئی۔
وادیِ نوم میں سفر کے دوران کسی کے آنے کی آواز آئی، یہ کچھ جانی پہچانی آواز لگ رہی تھی۔پہلی بار میں سوچا یہ خواب ہے، مگر جب جب آواز آئی تو کان کھڑے ہو گئے اور بے تحاشا اٹھ بیٹھا، دیکھا، سامنے وہ موجود ہیں۔
سلام و خیریت کے بعد میرے سامان کی چیکنگ شروع ہو گئی۔ارے! بیگ چھوڑ دو! میرا، میں نے بیگ کو اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔دیکھوں؛ تو صحیح ،اس بار کس کس کو اپنے سامان، کپڑے دے کر آئیں ہیں آپ۔
اس نے میرے ہاتھ سے کسی ڈاکو کی طرح بیگ چھینا اور پولیس کی طرح تلاشی شروع کر دی۔ میں مجبوراً چپ چاپ بیٹھ گیا۔ کیوں کہ مجھے اچھی طرح معلوم ہے۔کہ یہاں احتجاج کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔لہذا خاموشی ہی میں عافیت ہے۔
میں ایک مجرم کی طرح خاموش دیکھتا سنتا رہا ہے۔میرا سارا سامان اچانک سے بستر پر ڈال دیا اور بے رحمی کے ساتھ سب کو پھیلا دیا۔اپنے آشیانے کو اجڑتے دیکھ کر۔میرا کلیجہ دھک سے ہو گیا۔اب سوالات کی بارش شروع

ہوئی۔آٹھ جوڑے کپڑوں میں سے صرف تین ہی واپس ہے! باقی ؟

ارے،نہیں ۔میں نے بڑے فخر سے کہا۔ایک میرے جسم پر ہے نا۔

ہاں، ہاں، وہ جوڑ کر بول رہی ہوں ۔

اچھا! میں شرما گیا۔

مجھے ملال ہونے لگا کہ اتنے کپڑوں میں سے صرف تین ہی بچے ہیں ۔ ہائے افسوس! آخر کہاں؟ چھوڑے ہیں اپنے کپڑے؛ اب مجھے یاد آنے لگا؛ وہ ایک جوڑی فلاں جامعہ،ایک جوڑی فلاں جامعہ کے باتھ روم میں ۔اور شاید کسی جامعہ کے واشنگ مشین میں کپڑے ڈالا تھا۔مگر مجھے یاد نہیں ۔

اسی درمیان، جناب! تین جوڑے میں ۔ پاجاما صرف دو ہی ۔

ارے ایک پہنا ہوں نا۔ ہاں اس کو ملا کر ہی کہہ رہی ہوں ۔

اچھا! میں بولا وہ ایک جامعہ میں دھو کر ڈالا تھا بعد میں ملا نہیں ۔

اچھا، آپ اتنے بھولتے کیوں ہو! کیسے رہو گے دنیا میں !

چھوڑو؛ جی یہ سب باتیں ،اتنی فکر مت کرو، دنیا فانی ہے ۔ یہ چلے گئے تو دوسرے مل جائیں گے چنتا نکو کرو جی ۔

ہاں! ہاں! فری کے کپڑے تھے نا۔ وہ آپ نے تو میرے والدین کے دیئے ہوئے کپڑے بھی غائب کر دیئے!

ارے! وہ کپڑے تھے یا مچھر دانی ۔شکر ہے وہ گم گیئے ۔ ورنہ میں خود اسے عزت واحترام کے ساتھ گنگا ندی میں ڈال کر آتا۔

یہ سن کر وہ غصے سے گھور کر دیکھی اور ہمارے بچے ہوئے کپڑوں کو اتنے زور سے نیچے پھیکا کہ میں دیکھتا ہی رہ گیا۔دل تو کرتا تھا کہ اس کو اٹھا کر بستر سے نیچے پھینک دوں ۔مگر صبر کا دامن تھام لیا اور اپنے پھینکے ہوئے کپڑوں کے دامن کو دیکھنے لگا۔

آپ نے موبائل بھی گم کر دیا۔ٹوپی عمامے غائب! کسی دن آپ ہی غائب مت ہو جانا! آپ دوسرے جامعہ کا جائزہ لینے جاتے ہیں ۔مگر واپسی میں خود اپنے سامان کا جائزہ تو لے لیا کریں ۔ خدا نہ کرے کسی دن سب کچھ غائب کر کے صرف اپنے پہنے ہوے کپڑوں کے ساتھ گھر آئیں آپ ۔ ایسا نہیں ہوتا۔

فکر مت کرو آئیندہ خیال رکھیں گے ۔

نہیں آپ ایسے ہی ہو۔اس سے پہلے بھی وعدہ کیا تھا۔مگر پھر یہ حال!

ارے نہیں ؛تم تو میرے گلے ہی پڑ گئے ہو۔اب میں کیا کر سکتا ہوں! مجھے یاد نہیں رہتا ہے تو۔

اس بار صرف دو جوڑے ہی کپڑے لے جانا۔نہیں، ایسے ہی چلے جاؤں گا باباؤں کی طرح۔
آپ ہمیشہ میری بات کا مزاق اڑاتے ہو۔
یہ کہہ کر وہ غصے سے کمرے سے باہر نکل گئی۔اور میں دوبارہ نیند کی دعا پڑھکر سو گیا۔۔۔۔۔
میں گہری نیند میں تھا۔تب ہی پھر سے زوردار آواز آئی۔
اٹھیں؛ ناشتہ کرلیں اور یہ بتائیں کہ یہ جوتے آپ کو کس نے تحفے میں دئے،
یہ سن کر میں شرم سے پانی پانی ہو گیا کیوں کہ میں نے ہزاروں کے جوتے ایک مسجد میں گما کر سو روپے کی چپل لے آیا تھا۔۔اب وہ بولتی رہی میں صرف سنتا ہی رہا اور ''ایک چپ، سو سکھ'' کا فارمولا بہت کام آیا۔

☆☆☆

ہے دل بے حد یہ افسردہ

آج بہت زیادہ بے چینی سی لگ رہی تھی۔نماز ہال سے کمرے میں آیا۔مگر دل رنجیدہ اور ذہن پریشان۔اسی بے چینی و پریشانی کے عالم میں اکیلے ہی جامعہ سے باہر نکل گیا، اور مسجد قصر کی سیڑھیوں پر جا بیٹھا۔میں سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ آخر میرے دل کو کیا ہو گیا ہے۔تبھی اچانک یہ خیال آیا۔دل دھڑکنے کا سبب یاد آیا۔وہ تیری یاد تھی یاد آیا۔اوہ! اب صرف دو دن کی بات ہے۔اس کے بعد سب اپنے گھر کو چلے جائیں گے۔مجھے اس وقت اچانک یہاں کی چیزیں بہت زیادہ یاد آنے لگیں۔ میں دل کی تڑپ کو بالکل برداشت نہیں کر پایا، اور کسی عاشق صادق کی طرح دوڑتا ہوا جامعہ کی طرف بھاگا۔میں سیدھے جامعہ آیا۔دروازہ کھلا ہوا تھا۔جامعہ دیکھ کر کچھ قرار آ گیا۔میں اندر آیا۔تبھی اچانک میری نظر آفس پر پڑی میری آنکھیں نم دیدہ، جبیں افسردہ ہوگ ٔ۔مجھے ناظم صاحب کی شفقت، محبت ہماری تعلیم و تربیت کے لیے نصیحت کرنا۔بہت زیادہ یاد آنے لگا۔۔
دل کرتا ہے کہ آفس کے دروازوں کو پکڑ کر روؤ۔مگر میں اپنا درد اپنے اندر رکھنا چاہتا ہوں۔میں با دلِ ناخواستہ آگے بڑھا۔تبھی میری نظر نوٹس بورڈ پر پڑی تو ہمارے رزلٹ، حفلے اور مقابلے کی لسٹیں یاد آنی لگیں۔وہ لسٹ کیسی کیسی خوبصورت ہوتی تھیں۔ایسا محسوس ہوتا تھا کہ کسی بڑے ڈیزائنر نے بنایا ہے۔پھر میں آہستہ آہستہ کسی دیوانے مستانے کی طرح آگے بڑھا۔تبھی اساتذہ کرام کے کمروں پر نظر پڑی۔میں دیکھ کر شرمندہ ہو گیا کہ ان لوگوں نے ہماری تعلیم و تربیت کے لیے کیا کچھ نا کیا۔مگر ہم نے ان کی قدر نہیں کی جیسا کے ان کا حق تھا۔ہم نے ان کو کتنی تکالیف دی ہے۔افسوس۔یہ سوچتے سوچتے میں درجہ ثالثہ کی دیوار کو ٹیک لگا لیا۔ورنہ قریب تھا کہ میں غم سے

نڈھال ہوکر، گر جاتا۔ہم نے ان کو کتنا درد دیا ہے۔فجر وعصر میں شاید کوئی ایسا دن ہو،جس میں ایک بار کے جگانے سے جگ گیا ہوں۔ ہمیشہ تین چار بار جگانے کے بعد ہی نہایت ادب واحترام کے ساتھ شاہانہ انداز میں اٹھتا تھا۔ ایسا لگتا تھا۔کہ نظام میرے باپ دادا میں سے ہیں۔خیر میں کبھی کبھی سوچتا ہوں۔ہم نے اتنی تکلیف دی ہے۔اللہ نہ کرے کہ کسی دن ان کی آہ لگ گئی ہو اور میری زندگی برباد ہو جائے۔کیوں کہ دل تو ان کے پاس بھی ہے نا۔درد تو ان کو بھی ہوتا ہے نا۔مگر ہم نے ان کے درد کو کبھی محسوس کرنے کی کوشش نہیں کی۔آج مجھے بہت درد تکلیف ہو رہی ہے۔ میں دیوار سے ٹیک لگائے۔اساتذہ کرام کے کمروں کی طرف دیکھ رہا تھا کہ

کسی نے کہا :ارے بھائی کیوں رو رہے ہو؟ اب تو خوشی کا ماحول ہے۔چھٹی ہونے والی ہے۔

میں نے اسے رنجیدہ نگاہوں سے دیکھا۔اور کچھ جواب نا دیا۔وہ مایوس ہوکر چلا گیا۔میں اٹھا اور لائبریری کی طرف بڑھا۔اور کتابوں کو دیکھنے لگا۔ایک ایک کتاب کو حسرت کے ساتھ دیکھ رہا تھا۔کہ اے کاش! میں تجھے پڑھ لیتا۔ میں نے کتنا زیادہ وقت، بے فضول دوستوں کی یاری میں گزار دیا۔جس سے مجھے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔صرف نقصان ہی ہوا۔اے کاش! میں لائبریری میں پڑے رہتا۔اسے اتنی محبت،محنت سے تو ہمارے ہی لیے بنائی گئی ہے نا۔اتنی کتابیں ترتیب وار رکھی گئی ہیں۔۔میں کتابوں کو دیکھ کر رو رہا تھا۔مگر اپنے آنسو دوسروں سے چھپا بھی رہا تھا۔ تبھی کسی طرف سے آواز آئی۔اے بچے! تو مت رو۔ابھی بھی تیرے پاس بہت وقت ہے۔تو اب بھی ہم سے دوستی کر سکتا ہے۔میں تجھے کامیاب بنا دوں گی۔میں آواز کی طرف اچانک مڑ کر، دیکھا۔تو دنگ رہ گیا کیوں کہ ایک کتاب یہ باتیں بول رہی تھی۔مزید کتاب نے درد بھرے لہجے میں کہا:''مجھے تم لوگوں نے مزار بنا دیا ہے۔زیارت کیا اور چلے گئے۔''

اس کی باتیں سن کر میرا دل بہت افسردہ ہوا۔کہ ہم نے اپنے سال کو برباد کر دیا جتنا کر سکتے تھے اتنا نہیں کیا، سفیدالمدارس میں مدنی حلقے اور مقابلے کے لسٹ کو دیکھا۔تو ایک حد تک خوشی بھی ہوئی کہ الحمدللہ اس بار ہمارے جامعہ میں بہت ساری نئی چیزیں شروع ہوئیں۔مدنی حلقے کا سفر اور نفع فنکشن ہال تک کی ساری چیزیں یاد آنے لگی۔جس سے مجھے بہت فائدہ ہوا۔ پہلے بیان کرنا۔میرے لیے پہاڑ توڑنے کے برابر تھا۔مگر اب آسان ہے۔ یہ میرے اساتذہ کرام کی محنت اور درد ہم لوگوں سے سچی محبت ہے۔ورنہ کوئی اس زمانے میں اتنا کسی کے لیے نہیں کرتا۔

میں پریشان کبیدہ خاطر، آگے بڑھا اور زینے پر چڑھنے لگا۔تب ہی اچانک میرا پیر پھسل گیا۔اور میں گرتے گرتے بچا۔مگر سنبھل گیا۔سیدھا کھڑا ہوا۔تو اچانک ہنسی آ گئی اور وہ دن یاد آ گیا۔جب میں نے ٹھنڈا بخار (Cold Fiver) کے نام سے چھٹی لی تھی۔جیسے ہی چھٹی ملی تو میں خوشی سے اچھلتے کودتے تیزی سے جا رہا تھا۔

اس دن اسی طرح میرا پیر پھسل گیا تھا۔ہم لوگ بھی، نا جانے کیسے کیسے حیلے بہانے سے چھٹی لے کر تعلیم کا نقصان کرتے ہیں۔ میں یہ سوچتے ہوئے آگے بڑھا۔وضوخانہ پر نظر پڑی تو اچانک ماضی یاد آنے لگا۔کہ کس طرح ہزار بار سمجھانے کے باوجود ہم لوگ، عین جماعت کے وقت وضو کرنے آتے تھے۔اساتذہ کرام بولتے۔مگر ہم ان کی باتوں کو بھی غسل و وضو کروا دیتے تھے۔اب افسوس ہورہا ہے کہ ہم لوگوں کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔میں اوپر گیا تو میری نظر مدنی کلاس میں رکھے ہوئے ایک دسترخوان پر پڑی۔اس کو دیکھتے ہی بریانی، دال، چاول کی یاد آنے لگی۔ بالخصوص پیر شریف کی بریانی اوہ! اوہ! مت پوچھنا۔ پستہ ہاؤس، زعفران کی مندی پھینکی لگتی تھی۔اس کے ساتھ وہ ساتھیوں سے باتیں کرتے ہوئے کھانا۔وہ بوٹی کے لیے بحث و تکرار۔اس کی تعریف میں بہت کچھ کہہ سکتا ہوں۔گر میں شاعر ہوتا تو ایک دیوان بریانی کے نام لکھ دیتا اور اس کا نام دیوانِ بریانی رکھ دیتا۔

مگر پھر بھی ایک شعر کہہ ہی دیتا ہوں ؎

آپ تو نزدیک سے نزدیک تر آتے گیے
پہلے دل پھر دل ربا پھر دل کے مہماں ہوگیے

ویسے کھانے کی بہت ساری شکایات ہے مگر میں نے ہمیشہ اس بارے میں خاموشی اختیار کی اور صبر ہی کیا۔ کیوں کہ میں خود کو طالب علم ہی سمجھتا ہوں۔

آگے بڑھا اور نماز ہال میں پہنچا۔تو وہاں کی ہزاروں یادیں ذہن و دماغ میں گردش کرنے لگیں۔ پہلے کے تعلیمی حلقے اور اب کے تعلیمی حلقوں کا نظام۔فلک نما میں بہت تبدیلیاں آئی ہیں شاید۔ بالخصوص تیاری کے لیے ایک نظام الاوقات کا نفاذ ایک یادگار کام ہے۔جس سے ہمیں کافی فائدہ ہوا۔

اب کس کس کو یاد کروں۔ کس کو چھوڑ دوں۔ یہاں کی سیکڑوں یادیں ہمارے سینے میں محفوظ ہیں۔

میں چاروں طرف گھوم گھوم کر دیکھ رہا تھا کہ اچانک نظر واشنگ مشین پر پڑی۔ جو گرچہ بوڑھی ہو چکی ہے۔مگر کپڑے اچھے صاف کرتی ہے۔ میں دھیرے دھیرے اس کے پاس گیا اور پیار و محبت سے اسے چھونے لگا۔اور ماضی کی یاد میں گم ہو گیا۔کہ ایک بار ہم نے چار جوڑے کپڑے ڈالے تھے۔جس میں سے ہمیں صرف ایک جوڑے ملے۔باقی تین جوڑے شاید واشنگ مشین نے کھالیا ہے۔جو آج تک نہیں ملیں۔وہاں سے آگے بڑھا تب ہی میری نظر واپس زینے پر پڑ گئی اور ایک واقعہ یاد آ گیا۔کہ ایک بار دعاے مدینہ شروع ہو چکا تھا۔ میں تیزی سے بھاگا کہ کہیں گیٹ بند نہ ہو جائے۔راستے میں بھاگتے ہوئے عمامے باندھ رہا تھ۔بار بار باندھ رہا ہوں۔ مجھے پتہ نہیں آج میرا عمامہ چھوٹا کیوں ہو گیا ہے۔سمجھ نہیں آیا۔جیسے تیسے ہی باندھ لیا۔اوپر آیا۔تو گیٹ بند ہو چکا تھا۔لہٰذا تسلی

کے ساتھ مؤدب انداز میں دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا ہوگیا۔اور وہیں سے دعاے مدینہ پڑھنے لگا۔کہ شاید قبول ہوجائے۔تبھی پاس سے اشارے ہوئے۔میں پیر کی طرف دیکھا تو شرما گیا۔کیوں کہ جوتے دو رنگ کے تھے۔

کسی اور نے سر کی طرف اشارہ کیا تو ہاتھ سر کی طرف بڑھایا۔عمامے نکالا،تو دیکھ کر خوشی ملی اور الجھن کا حل نکل گیا۔کیوں کہ میں نے سر پر چادر باندھ لی تھی۔۔۔

اسی درمیان میں ٹنکی کے پاس جا کر ٹیک لگائے بیٹھ گیا اور رونے لگا۔سوچنے لگا کہ اے جامعہ! ہمارے دل و دماغ میں تیری بہت ساری یادیں ہیں۔کچھ تو ایسے ہیں۔جو بوڑھا ہونے کے بعد بھی بھولا نہیں جائے گا۔

پہلی یاد: رات کو ساڑھے گیارہ بجے ناظم جدول صاحب کا **صلّو علی الحبیب** کہنا۔کیا خوشی ہوتی تھی پوچھنا ہی نہیں۔اس آواز پر سب میں حرکت آجاتی تھی۔باتیں کرنے والے پڑھنے والے اونگھنے والے سب تروتازہ ہوجاتے تھے۔اسی طرح کھانے کی گھنٹی بجنا اس میں شاید کھانے کی خوشی کم،پڑھائی سے رہائی ملنے کی خوشی زیادہ ہوتی تھی۔اور عصر کے بعد باہر جانے کے لیے گیٹ کا کھلنا کسی جیل سے رہائی سے کم خوشی نہیں ہوتی تھی پھر باہر جا کر دوکانوں پے جھانکنا،سامانوں کا جائزہ لینا گھوم گھوم کر کھانا،مت پوچھنا پھر افسردہ ہوکر واپس آنا۔۔۔

اے جامعہ ترے در و دیوار کو سلام۔تیری فضاؤں کو سلام۔تیری نوازشوں کو سلام۔یہ میرا چمن ہے میرا چمن میں اپنے چمن کا بلبل ہوں۔۔۔یہ سوچتے سوچتے نہ جانے کب نیند آگئی اور میں سوگیا۔۔۔۔

مغرب میں کسی نے جگادیا کہ۔بھائی اٹھ جاؤ۔۔۔

میں اٹھا مگر میرا دل بہت بوجھل تھا۔۔۔۔

وضوخانے کی طرف بڑھا،مدہوشی کے عالم میں تھا۔اور وضوخانہ پر گر گیا۔آنکھ مسل کر دیکھا کہ کسی نے کپڑے دھوکر صابن وہیں چھوڑ دیا ہے۔

بری طرح چوٹ لگی۔یاد آیا کہ میں نے کئی بار ایسا ہی چھوڑا تھا۔خود سے اٹھا،کپڑے بدلے اور نماز پڑھا۔دعا کے لیے ہاتھ اٹھایا: یا اللہ! تو اپنے فضل وکرم سے اس جامعہ کو سلامت رکھ۔ہر اعتبار سے ترقی عطا فرما۔

کمرے میں آیا اور کتاب لے کر تیاری کے لیے بیٹھ گیا۔تبھی خیالوں نے مجھے گھیر لیا کہ یہ ماحول یہ احباب یہ اساتذہ۔گھر میں کہاں نصیب!۔گھر تو گھر ہی ہوتا ہے۔

خیر میں نے تیاری شروع کردی کہ کل میرا آخری پیپر ہے اب تک سارے پیپر اس بار بہت اچھے گیے ہیں۔الحمدللہ۔۔

☆☆☆

میں اچانک اکیلا ہوگیا

انسان کی زندگی بھی کتنی عجیب سی ہے نا! اسے زندگی میں بعض وہ چیزیں بھی کرنی پڑتی ہے۔ جس کے لیے وہ خود کو راضی نہیں کر پاتا ہے۔ اور کبھی سوچ بھی نہیں سکتا، کہ کیا سے کیا ہوگیا۔ کل میں کیسا تھا! اب کیسا ہوں! کل کہاں تھا؟ اب کہاں ہوں؟

ویسے میں ابھی ٹرین کی سیٹ پر لیٹا ہوں، اور ٹرین پوری رفتار سے چل رہی ہے۔ یہاں بہت سارے لوگ ہیں، مگر میرا اپنا شناسا کوئی نہیں ہے۔

اگست میں، میں فلک نما آیا تھا۔ اس وقت یہاں کے بارے میں اتنی جانکاری نہیں تھی۔ اب تو لگتا ہے کہ تعلیم سے متعلقہ ساری چیزیں مجھے معلوم ہیں۔ ویسے میں نے بہت ساری چیزیں سیکھی ہیں۔

جس طرح شروع سال میں مجھے ناموافق مزاج لوگوں سے واسطہ پڑا۔ ویسے ہی اللہ کی رحمت سے فلک نما میں اچھے احباب کی جماعت نصیب ہوئی۔

وہ آپس میں طنز و مزاح۔ آفس کی بہاریں۔ دسترخوان میں بیٹھک۔ جامعہ کو بہتر سے بہتر کرنے کے لیے دن رات کوشش۔

بہت ساری یادیں ہیں، مگر اچانک یہ میرے ساتھ کیا ہوگیا ہے! میں بالکل اکیلا ہی ہوگیا ہوں! وہاں تقریباً ہمیشہ ہی بچوں اور اپنے احباب سے گھرا ہوا رہتا تھا۔ مگر میں یہاں انجان ہوں۔ کوئی پہچان کا نہیں ہے۔

خیر شاید یہی زندگی ہے۔ جسے ہمیں نہ چاہتے ہوئے بھی قبول کرنا ہی پڑتا ہے۔

☆☆☆

سفر سے کس کو رستگاری ہے

میں ابھی اے سی میں بیٹھا ہوں۔ ٹرین اپنی رفتار سے چل رہی ہے۔

ٹکٹ میں نے تقریباً چار ماہ پہلے بنایا تھا۔ تب جا کر کنفرم ملا۔ اتنا لمبا سفر ٹکٹ کنفرم نہ ہو۔ تو بہت زیادہ آزمائش ہوتی ہے۔ جس کا تجربہ بھی ہے۔

ویسے اب اے سی ڈبوں میں بہت تبدیلی آ چکیں ہیں۔ پہلے اس کا بہت اہم مقام ہوتا تھا۔ اب کچھ خاص نہیں۔اور اے سی تھرڈ تو اے سی کا جنرل معلوم ہوتا ہے۔ وہ بھیڑ، تیز آواز سے موبائل سننا،فقیروں کا ہماری زیارت کے لیے آنا جانا اور بھی بہت کچھ۔

ویسے دور کے سفر کے لیے اے سی ہی بہتر ہے۔ بالخصوص گرمی کے ایام میں۔ گرچہ اس میں پیسے زیادہ خرچ ہوتے ہیں۔مگر سلیپر کے مقابل کافی سکون ہے، ورنہ سلیپر اور جنرل کا حال تو مردہ ہی جانے۔

زندگی میں سفر بھی کتنا ضروری ہے نا۔اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔اور کوئی سفر سے بچ بھی نہیں سکتا۔شاید اسی وجہ سے یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ دنیا میں کوئی انسان بغیر سفر کے ہی مر گیا ہو۔کبھی نا کبھی تو اس کو سفر کرنا ہی پڑے گا۔چاہے سفر لمبا ہو، چاہے چھوٹا۔اب تو بچہ پیدا ہوتے ہی سفر شروع کرتا ہے۔کیوں کہ اکثر کی پیدائش ہاسپٹل میں ہی ہوتی ہے۔پھر زندگی میں ہزار بار سفر، چاہے، نا چاہے کرنا ہی پڑتا ہے۔گر زندگی میں نہ کیا ہو،مگر مرنے کے بعد تو سفر کرنا ہی پڑے گا۔ ؎

موت جب تجھ کو آواز دے گی
گھر سے باہر نکلنا پڑے گا

ہاے غافل وہ کیا جگہ ہے جہاں
پانچ جاتے ہیں چار پھرتے ہیں

اسی تناظر میں گر دیکھا جائے تو حضرت آدم وحوا علیہما السلام کا سفر، جنت سے دنیا کی طرف، حضرت نوح علیہ السّلام کا کشتی کے ذریعے سفر، حضرت ابراہیم علیہ السلام کا بابل سے سفر، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اکثر سفر ہی میں رہتے تھے، جس کی وجہ سے آپ کو مسیح کہا جاتا ہے۔ بالخصوص مصطفیٰ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کا سفرِ شام، سفرِ طائف، سفرِ ہجرت اور نوری سفر یعنی شبِ معراج کا سفر لامکاں۔۔۔۔اسی طرح صحابہ کرام، علماے عظام اور اولیاے کرام علیہم الرحمۃ کا سفر تبلیغ اسلام۔۔۔۔

☆☆☆

ہاے میری گردن

عصر بعد، میں ایک درخت کے نیچے، درخت سے ٹیک لگائے، سوچ میں گم ہو گیا۔

یا اللہ! میں کہاں پھس گیا! مجھے تو یہاں رات بھر نیند بھی نہیں آتی ہے۔

میرے والد نے مجھے کس ادارے میں ڈال دیا ہے۔ اس سے بہتر تھا کہ وہ مجھے کسی قبرستان میں چھوڑ آتے تا کہ میں وہاں سکون سے تو رہتا۔

دراصل اس ادارے کا پرسنل حجاج بن یوسف اور نائب پرسنل مختار ثقفی تھا۔ جن کے ظلم وستم اور سختی سے دنیا خوب اچھی طرح واقف ہے۔

یہاں ہر دن کسی نا کسی کو کوڑے مارے جاتے ہیں۔ کسی نا کسی کو سر عام قتل بھی کیا جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے مجھے یہ ادارہ کم، جیل، قید خانہ زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ سبق تو طوطے کی طرح یاد کرنا پڑتا ہے۔ جدول کی پابندی کا تو پوچھنا ہی نہیں۔ یہاں تقریباً پندرہ سو کے آس پاس بچے ہیں۔ مگر شور وغل اور ہنگامہ آرائی کا کبھی تصور بھی نہیں کیا جا سکتا ہے۔

ابھی کسی بچے نے ذرا سی حرکت کی تھی۔ آفس میں بلا کر حجاج بن یوسف نے تحقیقات کی اور سب کے سامنے اس کی گردن ماردی۔ یہ منظر دیکھ کر سارے بچے رونے لگے۔ مجھے تو نیند تک نہیں آتی۔ کہ کب جگانے آجائے۔ ایک بار کی آواز سے سارے بچے اٹھ جاتے ہیں۔ پھر گر سویا ہوا کوئی مل جائے تو مختار ثقفی اس کو ہمیشہ کے لیے سلا دیتے ہیں۔

ایسے سخت الفاظ کا یہ لوگ استعمال کرتے ہیں کہ دل کرتا ہے کہ اے کاش! میں بہرا ہوتا تو اچھا ہوتا۔

نظام الاوقات کی پابندی اس قدر رہوتی ہے، کہ پوچھنا ہی نہیں۔ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ یہ آخر مجھے ایسا ادارہ کیوں ملا؟ میں نے کونسی غلطی کی ہے۔ تو یاد آتا ہے۔ ہم نے جو ماضی کے اداروں میں جو کیا ہے۔ سبق نا سنانا، جدول کے مطابق عمل نا کرنا، پریشان کرنا، سستی وکاہلی کرنا، متکبرانہ انداز وشاہانہ چال چلنا، شاید یہ اسی کی سزا ہے۔

ایک بار تو میں مرتے مرتے بچا، ہوا یوں کہ میں نماز میں ذرا تاخیر سے پہنچا، جس کی وجہ سے سنت قبلیہ چھوٹ گئی۔ میری خوش نصیبی کہ اس نماز میں حجاج بن یوسف ومختار ثقفی موجود نہیں تھے۔ بعد میں نے سنت بھی پڑھی اور سجدہ شکر بھی ادا کیا۔

ہاں ان سب کے باوجود میں اس کا اقرار کرتا ہوں۔ یہاں پڑھائی بہت اچھی ہوتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ بڑے بڑے مکار صوفی بن چکے ہیں۔ بدمعاشوں کے شہنشاہ، اب شرافت کا لبادہ اوڑھ چکے ہیں۔ حیلے بہانوں کے سلطان اب حجاج بن یوسف کے پاس بے بس ولاچار ہیں۔

ان حالات کی وجہ سے میں کئی بار ادارے سے بھاگنے کا ارادہ بھی کیا۔ مگر یہاں سے بھاگنا۔ کسی قبرستان سے

مردے کے بھاگنے کے مترادف ہے۔

کئی بار کوشش کرنے کا دل بھی کیا، مگر نتیجہ نے ڈرا دیا۔ کیوں اس کی سزا گردن زنی ہی ہے۔

آج میں بہت زیادہ پریشان ہوں، کہ میں کہاں پھس گیا! رخسار پے آنسوؤں ساون بھادوں کی طرح جارے ہیں۔ تبھی ایک شیطانی حیلہ ذہن میں آیا اور میں درخت کے نیچے سے اٹھا، سیدھے اپنے کمرے میں آیا، دروازہ بند کیا۔ اور رسی سے لٹک گیا کہ مر جاؤں، مگر، ہائے رے قسمت! کہ رسی اتنی کمزور تھی کہ ٹوٹ گئی اور میں نہایت شان و شوکت کے ساتھ زمین پر تشریف لایا۔ میری زمین پر تشریف آوری کی گونج نچلی منزل والوں کو ہوئی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے میری زیارت کے لیے بچے جوق در جوق آنے لگے۔

یہ خبر آفس میں پہنچی اور مجھے آفس میں طلب کیا گیا۔ میں پہنچا تو ایک کرسی پر حجاج بن یوسف اور دوسرے پر مختار ثقفی۔ میں ڈر سے کانپ گیا اور رسی کو کوسنے لگا کہ تو نے مجھے کہاں پہنچا دیا اے ذلیل رسی!

حجاج بن یوسف نے میری طرف دیکھ کر مسکرایا، جس کی وجہ سے میرے جسم میں کپکپی طاری ہوگئی۔ کیوں کمینے! مرنے کا بڑا شوق ہے؟ میں خاموش، نظر جھکائے فرش دیکھ رہا تھا۔

تبھی مختار ثقفی نے تلوار نکالی، جس کی آواز سے میں چونک گیا۔ جسم میں پسینے آنے لگے۔ حجاج نے اشارہ کیا اور مختار نے میری گردن ماردی۔ میں نے زور سے چیخا، اوہ! میری گردن! اوہ! میری گردن! ہائے میری گردن!

میرے والد پاس سوئے ہوئے تھے۔ انھوں نے میری گردن پکڑی، اور کہا: یہ ہے تیری گردن۔ میں اپنی گردن صحیح سلامت دیکھ کر۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا، کہ یا اللہ! یہ حجاجی خواب، کبھی حقیقت نہ ہو جب کہ میں بری طرح کانپ بھی رہا تھا۔

صبح کو، والدہ : یہ تم رات کو کیوں چلا رہے تھے؟

اوہ! خواب دیکھا تھا۔ بہت ڈراونا تھا۔ میں نے ماں کو پورا واقعہ سنایا۔ ماں غور سے سنی اور بولی بیٹے! اتنا اچھا ادارہ جو ملا ہے۔ اس کی قدر کرو۔ ورنہ تم کو کسی ایسے ادارے میں ڈالنا پڑے گا۔

اب میں اچھی طرح سمجھ گیا ماں۔ اپنے ادارے کی اہمیت کو۔

☆☆☆

کسی اور سے کروں میں کیا شکوہ

آج بچوں کا سالانہ امتحان چل رہا ہے۔ مگر میں اکیلے کمرے میں لیٹا ہوں۔

میں نے رخصت لے لی ہے۔ پتہ نہیں کیوں! آج بالکل بھی جانے کا دل نہیں کیا اور میں کمرے ہی میں رہ گیا۔

عجیب چیز ہے نا، گر کوئی دل و جاں سے کام کرتا ہے پھر جب اس کو دلی صدمہ پہنچایا جاتا ہے۔ اس وقت وہ اکیلے رہنا پسند کرتا ہے۔ اس کے سوا کیا چاہتا ہوں، کہ بچے پڑھے مگر یہ بچے اللہ کی پناہ۔

یہ ہماری قسمت تھی کہ ہمیں ایسے بچے ملے ہیں، جو بالکل ناقدر، کاہل اوسست ہیں۔ ان کے پیچھے ہم نے اپنا سب کچھ لگا دیا، ان کے لیے ہم نے جتنا کیا ہے۔ مجھے یاد ہے۔ میں نے اپنے والدین کے لیے نہیں کیا ہے۔ جتنے نازنخرے

میں نے ان کے اٹھائے ہیں۔ کسی کے نہیں اٹھائے ہیں اور نا ہی اٹھانا ہے۔ دن رات ایک کر کے ان کی بہتری کی بات کرو؛ سب کچھ ان پر نثار کرو؛ بدلے میں غم، پریشان، دکھ اور سب سے بڑھ کر دل آزاریاں ویسے بھی اس سال جو کچھ میرے ساتھ ہوا۔ وہ زندگی بھر یاد رہے گا۔ مجھے یاد ہے۔ ہم نے اپنے اساتذہ کرام کے ساتھ ایسا کبھی نہیں کیا۔ شاید مجھے ایسا لگتا ہے، جتنی محنت اور دل سوزی کے ساتھ، ہم نے ان کے لیے کام کیا، اتنا گر ہم نے دنیا کمانے کے لیے کیا ہوتا تو آج کچھ اور ہوتے۔

اس موقعے پر مجھے اپنا واقعہ یاد آ گیا۔ میں جب کیرلا میں پڑھ رہا تھا، کچھ چیزوں کی وجہ سے میں نے جامعہ چھوڑ دیا، دوسری جگہ جا کر انگلش کی کوچنگ میں داخلہ لے لیا۔ فیس بھی جمع کر دیا۔ کئی دنوں کے بعد۔ اپنے ایک ساتھی کو فون کیا۔ تو معلوم ہوا کہ جب استاد کو معلوم ہوا کہ فیض چھوڑ کر چلا گیا ہے تو انہوں نے کلاس میں بہت سخت ناراضگی کا اظہار کیا۔ اس ساتھی نے کہا فیض! استاد بہت ناراض ہیں تم واپس آ جاؤ۔

مجھے بہت زیادہ تکلیف ہوئی کہ استاد کو میری وجہ سے تکلیف ہوئی کہیں میں برباد نہ ہو جاؤ۔ میں نے والد صاحب کو فون کر کے کہا کہ آپ میرے استاد کو فون کر کے کہہ دیں کہ فیض سے غلطی ہوگئی ہے۔ وہ واپس آنا چاہتا ہے۔ خیر میں واپس آیا اور ڈرتے ڈرتے استاد کے کمرے میں گیا۔ جیسے ہی انہوں نے دروازہ کھولا میں نے ان کے پیر پکڑ کر معافی مانگی۔ کچھ دن ناراض رہ کر معاف کر دیا۔ اسی چیز نے غالبًا مجھے کامیاب کر دیا اور مجھے ان کے جیسا تدریس کرنے کا کچھ حد تک انداز نصیب ہو گیا ورنہ من آنم کہ من دانم۔۔۔۔

☆☆☆

نہیں، کھیل اے داغ! یاروں سے کہہ دو

میں ابھی اپنے کمرے میں بیٹھا ہوں۔ میرے سامنے ایک چھوٹا سا ٹیبل ہے۔جس پر ایک کاپی ایک قلم اور دیوانِ غالب رکھا ہوا ہے۔

کل سے ذرا ہمارے شہر کا موسم بارشی ہے۔ٹھنڈ بھی لگ رہی ہے۔ جب کہ کل سے پہلے موسم بہت گرم تھا۔خیر رمضان میں بارش، یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے۔

غالبًا اشرفیہ کے دور سے ہی میرا یہ معمول ہے کہ میں رمضان میں مطالعہ کرتا ہوں۔ اس درمیان میں نے ''مقالات مصباحی''، ''شہاب نامہ''،'' داستان ایمان فروشوں کی''اور''خامہ تلاشی''وغیرہ مختلف کتابوں کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے۔۔۔

اس سال میں''دیوان غالب'' لے کر بیٹھا ہوں دوسو سے زائد صفحات کا مطالعہ کر چکا ہوں۔مگر میں کھلے لفظوں میں اس بات کا اقرار کرتا ہوں کہ مجھے اکثر شعر کا مطلب بالکل بھی سمجھ نہیں آتا ہے۔ بلکہ میرے لیے غنیمت یہ ہے کہ صحیح تلفظ اور رموز اوقاف کی رعایت کر کے صرف پڑھ ہی لوں۔ مطلب ومفہوم''ہنوز دلی، دور است'' کا معاملہ ہے۔

یہ بات میں اس وجہ سے کہہ رہا ہوں، کہ ہم میں سے اکثر کو لگتا ہے۔ کہ ہمیں اردو ادب سیکھنے کی کیا ضرورت؟! یہ تو ہماری مادری زبان ہے۔مگر ایں خیال خام است وخواب شیخ چلی است۔ ویسے بھی اصولی اعتبار سے ہمیں کوئی زبان آئے یا نہ آئے اپنی مادری زبان اچھی طرح آنی ہی چاہیے۔۔مگر اس کے لیے ہمیں سخت محنت وکوشش کرنی پڑے گی، کیوں کہ اردو کوئی آسان زبان نہیں، کہ بے سیکھے ہی آجائے،شاعر کہہ گیا۔۔ے

نہیں کھیل اے داغ! یاروں سے کہہ دو
کہ آتی ہے اردو زباں آتے آتے

ابھی ہمارے پاس چھٹی کا سنہرا موقع ہے۔ہم زیادہ سے زیادہ اردو ادب کا مطالعہ کریں۔

☆☆☆

مچھرستان کا قبرستان

انسان ویسے تو بڑا طاقتور مانا جاتا ہے، کہ سورج، چاند، پہاڑ، ہوا اور بڑے بڑے سرکش جانوروں کو تابع کر چکا ہے۔مگر کچھ چیزوں کے سامنے وہ آج بھی بہت بے بس اور بڑا مجبور ہے۔

میرے خیال میں مچھر ان میں پہلے نمبر پر ہے۔جس کے سامنے انسان بے بس ہے۔اس کی بے بسی کا اندازہ

اسی سے ہوتا ہے، کہ انسان دنیا کی تقریباً ہر چیز کو اپنے قید میں کر سکتا ہے۔ مگر مچھر کے سامنے وہ اس طرح مجبور ہے کہ خود کو مچھر دانی میں قید کر لیتا ہے۔ تب جا کر کہیں سکون کی نیند لے پاتا ہے۔ یعنی ظالم کا اتنا رعب و دبدبہ کہ مظلوم اندر اور ظالم باہر۔

ابھی رات کے تقریباً ساڑے گیارہ بج رہے ہیں۔ میں کمرے میں اکیلے ہی سویا ہوں۔ باہر سے کتوں کی آوازیں آرہی ہیں۔ جو پطرس کے ''کتے'' مضمون کی یاد تازہ کرر ہے ہیں۔ میری خوش نصیبی یہ کہ مجھے قید خانہ (مچھر دانی) میں نہیں ڈالا گیا۔

میز بان نے آلاوٹ تو لگا دیا ہے۔ مگر مچھر پھر بھی ہمیں ستا رہے ہیں۔ مجھے سب ستا رہے ہیں، میرا جسم دکھا رہے ہیں۔ کمبل اوڑھے منھ چھپائے سویا تھا۔ تا کہ یہ ظالم مجھے لاش سمجھ کر چھوڑ دے۔ مگر ان کمبختوں کی آوازیں کونسی بلبل کی آوازیں ہیں، جو بھلی معلوم ہوں، اوپر سے گرمی، ناچار اٹھ بیٹھا اور ان کے خلاف لکھنے لگا۔

یہ ابھی بھی مجھے مسلسل کاٹ رہے ہیں۔ اس سے پہلے کہ ان میں سے کسی کو خبر ہو کہ میں ان کے ہی خلاف لکھ رہا ہوں، اور یہ اپنی پوری فوج اکٹھی کر لیں۔ مجھے جلدی جلدی مکمل کر لینا ہے۔۔۔

میں ابھی کچھ دنوں سے ان سے بہت پریشان ہوں۔ کبھی سوچتا ہوں کہ دنیا نے نا جانے کس کس چیز کی دوا بنا لی۔ مگر مچھر کی موثر ترین دوا بنا نہ سکی۔ بچپن سے ان کا عتاب جھیل رہا ہوں۔۔

ویسے کچھ چیزیں ایجاد ہوئیں۔ مگر ایسا لگتا ہے کہ ان مچھروں کے پاس کوئی ایسی ماہر ریسرچ ڈاکٹروں کی ٹیم ہے جو ان کو ہر نو ایجاد دوائی سے لڑنے کی ویکسین دے دیتی ہے۔۔ اب دیکھیں مورٹین کا ایجاد ہوا۔ مگر اثر ندارد، صرف قوت پرواز، اور دھواں کچھ دیر میں ختم۔ گویا کچھ دیر کے لیے لوک ڈاؤن لگا، پھر ختم۔

اسی طرح مچھر بتی بنی، اب سونے والا اپنے پاس لگا کر سوئے، گویا کسی مردے کے پاس اگر بتی لگائی گی ہو۔ مزید خطرہ یہ کہ ان دونوں میں آگ ہوتی ہے۔ جس کی وجہ سے بستر اور گھر میں آگ کا لگنا، بہت آسان ہے۔ اور بسا اوقات ایسا ہوتا بھی ہے، کہ بے چارہ مچھر مارنے کے لیے لگایا، صبح خود ہی مر گیا۔۔

ویسے اس بارے میں دیہاتی بھی کسی سے کم نہیں ہے یہ لوگ مچھر کو گھر بدر کرنے کے لیے کسی چیز کو جلاتے ہیں جس کے دھوے کی وجہ سے مچھر بھاگ جاتے ہیں یہ زیادہ تر جانوروں کے لیے کیا جاتا ہے۔ مگر اس کی وجہ سے آدمی کو سانس لینے میں دقت وغیرہ وغیرہ مسائل پیش آتے ہیں۔۔

ایک بار تو میں ان کے ظلم و ستم سے اتنا زیادہ دل برداشتہ ہو گیا کہ پوچھو ہی مت۔ مجبوراً ایک بڑے ڈاکٹر کے پاس چلا گیا۔ دیکھا تو ڈاکٹر صاحب نیند میں جھوم رہے ہیں اور مچھر ان کے ہاتھوں کو چوم رہے ہیں۔ یہ دیکھ کر دنگ

رہ گیا یہ کمبخت مچھر ان کو بھی نہیں چھوڑتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب! ڈاکٹر صاحب! ڈاکٹر صاحب،

مدہوشی کے عالم میں بولے ''مجھے سحری نہیں کھانی ہے آپ لوگ کھالو'

اوہ! میں چونک گیا، سوچا، لگتا ہے کہ رات کو سوئے نہیں ہیں۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کو ہاتھ سے ہلاتے ہوئے بولا، آپ گھر میں نہیں، دواخانے میں ہیں،

ڈاکٹر غصے بھرے آنکھوں سے دیکھا، اور بولا: بولو! کیا ہوا ہے؟ جی میں کئی دنوں سے بہت پریشان ہوں، رات بھر سو نہیں پاتا ہوں۔

ڈاکٹر نے میرا اچھی طرح معاینہ کیا۔

بولا سب کچھ تو نارمل ہے۔ پھر بھی تمہیں نیند کیوں نہیں آرہی ہے؟۔

ڈاکٹر :اچھا یہ بتاؤ، رات کو مچھر دانی لگا کر سوتے ہو یا یوں ہی۔ لگا تا ہوں ڈاکٹر صاحب، مگر اس میں ذرا سو راخ ہو گیا ہے، جو بہت چھوٹا سا ہے۔ مگر نا جانے ان کمبختوں کو کیسے معلوم ہو گیا۔ اس سے وہ آجاتے ہیں، اور رات بھر نہیں سونے دیتے ہیں۔۔ ان کا کوئی صحیح علاج کر دیجیے۔

یہ بات سن کر، اب ڈاکٹر ہی اپنا درد سنانے لگا، کہ بھائی میں خود پریشان ہوں۔ ان ظالموں سے میری نیند کا ستیاناس کر دیا ہے۔ اب تو دل کرتا ہے کہ یا خود زہر کھالوں یا ان پر پرمانو بم گرادوں۔ تا کہ ان کا وجود دنیا سے ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے۔۔ یہ کہتے ہوئے ڈاکٹر صاحب کے آنسو بہنے لگے، میں سمجھ گیا، یہ مجھ سے زیادہ مظلوم ہیں۔۔ میں نے ان کو تسلی دی، اور یہ کہتے ہوئے نکل گیا۔

ارے! ڈاکٹر صاحب! پرمانو، تو کیا۔ دنیا کے سارے بم گرادو، مگر یہ کمینے لوگ مرنے والے نہیں ہیں۔۔ بس دعا ہے کہ مرنے کے بعد قبر میں نہ کاٹیں، ورنہ آدمی وہاں کیا کر پائے گا، دوہرا عذاب برداشت کرنا پڑے گا۔

وہاں سے مایوس ہو کر، واپس آرہا تھا کہ میری نظر ایک الکٹرانک دوکان پر پڑی۔ سوچا، ذرا یہاں معلوم کرتا ہوں،

شاید کچھ مل جائے، وہاں جا کر میں نے ایک ہی سانس میں اپنی داستان سنا دی۔

دوکان دار :آپ صحیح جگہ آئے ہیں۔ آپ بے فکر ہو جائیں۔ ہم ابھی آپ کو اس کی صحیح دوائی دیتے ہیں۔

اس نے ایک بیڈمنٹن لا کر دیا اور چلانے کا طریقہ بتا دیا جو مجھے بہت پسند آیا۔ میں خوشی خوشی گھر آیا کہ اب تو گھر

کے کونے کونے سے ایک ایک کو نکال بھگاؤں گا۔ ہو سکے تو پورے محلے سے، بلکہ پوری شہر سے، نہیں، بلکہ پورے مل۔۔۔۔ک۔۔

کیسے کیسے خیالات میرے ذہن میں آنے لگے۔

گھر آیا اور مچھروں کی تلاش شروع کر دیا۔ تو سب کچھ بھول ہی گیا۔ ایک بار تو ایک مچھر کے پیچھے بھاگتے بھاگتے باتھ روم میں گھس گیا۔ مگر وہ چالاک کمبخت مچھر باتھ روم کے پانی نکاسی والے سوراخ میں گھس گیا۔ میں دانت پیستے ہی رہ گیا۔ کچھ دیر انتظار بھی کیا مگر مایوسی ہی ہاتھ لگی۔

اب میں جہاں بھی بیٹھتا ہوں، عصا کی طرح بیڈمنٹن اپنے ساتھ رکھتا۔ جیسے ہی کچھ بھنک لگتی ہے۔ فوراً بیڈمنٹن گھومانا شروع۔ جیسے ہی کوئی شکار پھنسے تو اس کے پھٹنے کی آواز سے دل مچل جاتا ہے۔ اور چہرے پر خوشی کے آثار ظاہر ہوتے ہیں۔

ایک بار اس نے از راہ مزاق کہہ دیا۔ آپ تو بالکل ثانیہ مرزا کی طرح بیڈمنٹن چلاتے ہو، اس بات سے مجھے بہت تکلیف ہوئی۔ دل تو کرتا تھا کہ اسے بھی مچھر کی طرح مار دوں۔ مگر کچھ سوچ کر چھوڑ دیا۔

اب میں تقریباً پوری پوری رات جب موقع ملتا ہے مچھر ہی مارتا رہتا ہوں۔ کیوں کہ اس سے مجھے بہت زیادہ خوشی ملتی ہے۔ جیسے میں اپنے برسوں کے دشمن کو تہ تیغ کر رہا ہوں۔ مجھے بیڈمنٹن سے اتنی محبت ہوگئی ہے کہ اس کو اپنے پاس ہی رکھ کر سوتا ہوں۔۔

ایک رات میں مچھر مار رہا تھا اور بہت خوش تھا۔ تبھی پاس سے ایک منحوس آواز آئی۔ ارے! یہ کیا لگا رکھے ہو! بچوں کی طرح، اب بس بھی کرو! مجھے سونے دو۔ ایک بج چکے ہیں۔ جب دیکھو، پٹ پٹ، کسی دن میں تمھارے بندوق کو کچرے کے ڈبے میں ڈال آؤں گی۔ یہ سن کر میں ذرا ڈرا اور اس کو سر کے پاس رکھ کر سو گیا۔ تبھی خواب میں دیکھتا ہوں، کہ میں مچھرستان میں موجود ہوں۔ ہر طرف مچھر، مچھر اور ان کی منحوس آوازیں۔ ایسی شکل، ایسی آوازیں کہ دل پھٹ جائے۔

کچھ دیر بعد ایک طرف سے آواز آتی ہے۔ ہاں یہی ہے جو ہمارے اوپر بم باری کرتا ہے۔ دوسری طرف سے آواز آئی اس نے ہمارے قبیلے کے بہت سارے افراد کو مار ڈالا ہے۔ کسی نے کہا آج موقع ملا ہے۔ اس سے بدلہ لے لو۔ میں اکیلا، اتنے سارے مچھر، الگ الگ شکل وصورت کے مچھروں کو دیکھ کر پریشان ہو گیا، جسم کانپنے لگا۔ پھر کچھ ہی دیر میں مچھروں کی ایک فوج نے مجھ پر حملہ کر دیا۔ میں نے ہمت کر کے، فوراً ہی اپنا بیڈمنٹن نکالا۔ مگر افسوس! اس میں بالکل بھی چارج نہ تھا۔ پھر بھی اسی کو تلوار کی طرح آخری دم تک گھوماتا رہا، مگر چاروں طرف سے مچھر ہی

مچھر، بیچ میں، میں اکیلا، ایسے میں اپنی جان بچانا سب کے بس کی بات نہیں۔ بالآخر ان لوگوں نے مجھے مچھرستان کے قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔

صبح جب آنکھ کھلی۔ تو میں چپ چاپ رہنے لگا۔ اب بالکل بھی بیڈمنٹن چھونا کا دل نہیں کرتا ہے۔ بیوی سوچ رہی ہے کہ شاید رات والی بات اثر کر گئی ہے۔ وہ دل ہی دل میں خوش ہو رہی ہے۔ مگر یہ تو میرا دل جانتا ہے کہ میں مچھرستان والے خواب کی وجہ سے خاموش ہو گیا ہوں۔

وہ بولی: کیوں، جی ثانیہ مرزا نہیں بننا ہے اب۔۔

میں نے غصے سے اسے گھور کر دیکھا اور غصے میں بولا کہ ویسے جناب کو معلوم ہونا چاہیے ثانیہ بیڈمنٹن نہیں کھیلتی بلکہ ٹینس بال کھیتی ہے۔ میرے اس بات سے تلملا اٹھی اور میں اسے تلملاتا دیکھ کر مسکرا دیا جو اس کی تلملاہٹ کے مزید اضافے کی وجہ بن گئی۔ موقعے کی نزاکت کو سمجھ کر میں گھر سے باہر چلا گیا۔

☆☆☆

عشق کتابوں سے

یہ ۲۰۱۷ کی بات ہے۔ جب اشرفیہ سے میری فراغت ہوئی۔ جس اشرفیہ نے ہمیں کتابوں سے عشق کرنا سیکھایا۔

اسی درمیان نانی کے گھر جانا ہوا، تو یاد آیا کہ یہاں ماضی قریب میں، ایک بڑے عالم دین گزرے ہیں۔ ہو، نا ہو ان کے گھر میں کتابیں ضرور ہوں گیں۔

اسی کی معلومات حاصل کرنے کے لیے، میں اپنے ماما کے ساتھ گیا اور ان کے بیٹے سے پوچھا۔ بولے، بہت ساری تھیں۔ مگر ایک فلاں شخص لے گیا۔

کچھ ابھی ہیں، گھر میں پلاستر کا کام چل رہا ہے۔ اسی وجہ سے چھت پر ڈال دیا ہوں۔ ہم لوگ گیے تو ہمیں سمجھ آیا کہ زاغوں کے تصرف میں عقابوں کا نشیمن کا مطلب کیا ہوتا ہے

میں نے کہا: مجھے لینا ہے۔ ٹھیک ہے لے لو۔

بارش کی وجہ سے وہ بہت حد تک بھیگ گئیں تھیں۔ پھر بھی میں نے چن چن کر دو بورے بھر کر لیئے۔ مجھے افسوس کتابوں کی ناقدری پر ہو رہی تھی اور خوشی اتنی ساری اور پرانی کتابوں کے ملنے پر۔

ان کے ملنے پر میں بہت زیادہ خوش تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ کسی فلسطینی بھوکے بچے کو اچانک حیدرآبادی بریانی مل گئی

ہو۔مگران کی نا گفتہ بہی حالت دیکھ کرافسوس بھی ہورہا تھا۔۔
وہ ساری کتابیں گھر لایا۔کئی دن ان کو دھوپ میں ڈالا۔سب کا اندراج کیا،تو ساٹھ سے زائد کتابیں نکلیں۔ میرے لیے یہ بہت بڑا قیمتی سرمایہ ہے۔جس دن میں کتابیں لے کرآیا تھا۔اسی رات کو بہت تیز بارش ہوئی اور یہ بات یقینی تھی ان کا بیٹا ان کتابوں کی کبھی حفاظت نہیں کرتا اور دھوپ اور بارش کی وجہ سے وہ علمی سرمایہ ہمیشہ ہمیش کے لیے ضائع ہوجاتا۔۔
کتابیں مختلف موضوعات کی ہیں۔کچھ ایسی کتابیں بھی ہیں۔جواب شاید بمشکل ملیں۔۔
میری گنبد خضریٰ لائبریری میں، جہاں بہت ساری کتابیں ہیں۔مگر جو خوشی ان کتابوں کو دیکھ کر ہوتی ہیں۔وہ کسی اور کو دیکھ کر نہیں ہوتی۔۔

☆☆☆

ایک مردے کی داستان

جب میری موت کا وقت قریب آیا اور روح نکلنے والی تھی۔اس وقت میں نے کلمۂ طیبہ پڑھنے کی بھرپور کوشش کی ،اور بمشکل پوری کوشش کر کے پڑھ سکا۔ہاں،گراس وقت کوئی مجھے تلقین کرتا،تو آرام سے پڑھ لیتا۔
صدافسوس میری اولاد پر کہ وہ مجھے اس حالت میں دیکھ کر رونے ،چیخنے اور شوروغوغا مچانے لگے۔کلمۂ طیبہ کا ورد نہیں کیا کہ بآسانی میری روح نکل جائے۔۔
ایک تو مجھے اس حالت میں دیکھ کر ڈاکٹر کے پاس بھاگا، کچھ مولوی صاحب کی طرف دوڑے، کچھ میری سانس کی دوائی لانے گیے۔جب کہ میری عمر،موت والی ہوچکی تھی۔یہ بات سب کو معلوم بھی تھی۔
اس درد وکرب کے عالم میں اتنا شوروغوغا، دل تو کرتا تھا کہ ہر ایک کو دو تین تھپڑ رسید کردوں اور سکھاؤں کہ جانے والے کو کس طرح الوداع کیا جاتا ہے۔مگر میں مجبور تھا۔۔
جب میری روح جسم سے نکل گئی تو اچانک چیخ و پکار کی ایک تیز آندھی چلی۔اتنی تیز کہ گر میں زندہ ہوتا تو اسی آواز سے مرجاتا۔خیر شکر، کہ میں پہلے ہی مر چکا تھا۔۔
میری لاش کو ان لوگوں نے ایک جگہ رکھ دیا، پھر دوست کیا! دشمن کیا! کیا اپنے! کیا بیگانے! سب دیکھنے آنے لگے۔گویا میں کچھ دیر کے لیے مزار بن گیا۔
میرے پاس اگربتی بھی لگادی گئی۔جس کی مہک مجھے بالکل بھی پسند نہیں۔لیکن میں مجبور تھا۔کیوں کہ میں مر چکا

تھا۔ ورنہ میں اس کو اٹھا کر اتنی دور پھینکتا کہ۔۔۔۔۔سب دیکھتے ہی رہ جاتے۔۔
اس کے بعد کا مرحلہ تو اور کٹھن اور صبر آزما۔ میری روح صبح نکلی تھی اور جنازہ عصر کے بعد رکھا گیا۔ اتنی دیر مجھے عورتوں کے بیکار کی باتیں سننا پڑا۔ ان کا بناوٹی رونا دھونا، الا ماشاءاللہ
زندگی میں مجھے کسی کا لیکچر سننا پسند نا تھا۔ اب مرنے کے بعد جاہل عورتوں کی بے سروپا باتیں، بے سر رونا دھونا۔ اللہ کی پناہ۔ ایک مردے کے لیے یہ کسی عذاب سے کم نہیں۔ ایک بھی عورت نا تو قران پڑھ رہی ہے۔ نا ہی کلمہ، درود۔ بہت سارے تو ناپاک بھی ہیں۔۔ اور سب مجھے چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں۔ روتے ہیں، پھر باتیں کرتے ہیں، کچھ تو مزاق بھی کرر ہے ہیں، دنیا بھر کی باتیں، ایک دوسرے کے گھر کے حالات پوچھ رہے ہیں۔
مزید یہ رسم بد کہ میرے اپنے گھر کے لوگ جن کو آخری وقت میں میرے پاس رہنا چاہیے۔ وہ ٹینٹ، کرسی، کھانا اور مہمانوں کے نازنخرے اٹھانے میں لگے ہیں۔
ارے، میرے بےوقوف بیٹوں! مجھ سے ملو، میرے پاس رہو۔ آج کے بعد پھر تم مجھے کبھی دیکھ نہیں سکتے ہو
بعض نا ہنجار تو آ کر پہلے چائے ناشتہ کرر ہے ہیں۔ کچھ میرے بیٹوں سے پوچھ رہے ہیں۔ کتنی کرسیاں لائے ہو اور گوشت کتنا منگا رہے ہو؟ جی وہ سو کرسیاں ہیں۔ گوشت تیس کیلو لایا ہوں۔ ارے دس کیلو اور بڑھا لو۔ تمارے ابو کے بہت پہچاننے والے ہیں۔ کہیں شکایت نہ ہو جائے۔
ادھر کفن کے اندر میں حیران تھا کہ کیوں بھائی! کیا ضرورت ہے! کیا یہ لوگ میری شادی میں آئے ہیں۔ کہ کھانا کھلایا جائے اور خاطر تواضع کیا جائے۔۔
آج ٹینٹ، کرسیاں، ٹیبل اور آنے والوں کے لباس فاخرہ دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ میں دولہا بنا ہوں۔ بس فرق یہ ہے۔ زندہ دولہا کو سہرا تو مجھ مردے دولہے کو کفن دیا گیا ہے۔
آج پہلی بار میں اپنی اتنی تعریفیں سن رہا تھا۔ مجھے خوشی بھی ہو رہی تھی اور تعجب بھی کہ اچھا! میرے اندر، یہ خوبیاں بھی تھی۔ زندگی میں تو لوگ میرے عیبوں کو ہی تلاش کرتے رہتے تھے۔ صبح سے ان عورتوں کے کچ کچ سے دل رنجیدہ اور دماغ خراب ہو رہا تھا۔ دل کرتا تھا۔ اٹھ کر قبرستان کی طرف بھاگ جاؤں۔
ایک عورت تو اتنی مکار کہ پوچھو ہی مت۔ ابھی دیکھو خاموش، جیسے ہی میرا کوئی قریبی رشتے دار آیا۔ آواز سے رونا شروع۔ پھر کچھ دیر بعد خاموش۔ پھر اِدھر اُدھر کی باتیں۔ کسی کی غیبت، چغلی بھی چل رہی ہے۔
یہ رونی والی عورتیں بہت چالاک ہوتیں ہیں۔ اب دیکھو: ایک مرد رشتے دار آیا۔ اس کو دیکھ کر زور سے رونا شروع، کہ اب تمہارا کیا ہوگا! یہ ہم لوگوں کو اکیلا، بے سہارا چھوڑ کر چلے گئے! اب آنے والے کو رونا نہیں آ رہا تھا۔ پھر

بھی اس نے کوشش کر کے، رونے کی سی صورت بنائی، تاکہ بعد میں کسی کو انگلی اٹھانے کا موقع نا ملے۔ یہ عورت صورتحال کو سمجھ کر خاموش ہوگی۔ گرا تفاق سے کوئی اسی طرح رونا والی مل جائے۔ تو، ؎

جو اس شور سے میر روتا رہے گا
تو مردہ کاہے کو سوتا رہے گا

اس معاملے میں مرد حضرات قدرے اچھے ہوتے ہیں پر عورت کا حال تو مردہ ہی جانے۔

اسی درمیان، میرا ایک بیٹا دہلی سے آیا۔ اس کو دیکھ کر سب عورتیں ایک بار پھر تیز آواز سے رونا شروع۔ ایسا لگتا ہے کہ مردے جسموں میں اچانک جان آ گی ہو۔ پھر کچھ دیر بعد سب ٹھنڈے۔ یہ بریک لے لے کر رونا۔ میری سمجھ سے بالا ہے۔

اللہ تعالیٰ گر بنی اسرائیل کے مقتول کی طرح مجھے اتنی طاقت دیتا تو اٹھ کر سب کو اچھے طریقے سے مارتا اور پھر کفن اوڑھ کر مر جاتا اور کہہ دیتا کہ آئندہ کوئی بھی اپنے مردے کی لاش کے پاس اس طرح نہیں روئے گا۔ یا تو تلاوت کرے یا کلمہ، درود پڑھے۔۔

ایک عالم صاحب آئے۔ مجھے بہت خوشی ہوئی۔ انھوں کلمۂ استرجع پڑھا۔ ایک ختم قرآن شریف ایصال کیا اور دل ہی دل میں دعا کر کے۔ سکون واطمینان کے ساتھ چلے گئے۔ انہوں نے ان لوگوں کو رونے سے منع بھی کیا کہ مردے کو اس تکلیف ہوتی ہے۔ مگر ان کو تو کسی مردے کی تھپڑ کی ضرورت ہے۔۔

نہلانے میں بھی وہی حال۔ اب وہاں میرے ساتھ کیا ہوا۔ وہ میں نہیں بتا سکتا ہوں۔۔

قبرستان لے جانے میں کافی دقت کا سامنا کرنا بڑا۔ پہلے عورتوں کے ظلم برداشت کیا اور اب مردوں کا۔ یعنی جس کو جب موقع ملا اس نے پریشان ہی کیا۔ ایک پایہ کوئی ادھر کھینچ رہا ہے۔ دوسرا ادھر۔ کلمہ، درود سے کسی کو کوئی مطلب نہیں۔ صرف دنیاوی باتیں، کچھ لوگ میری اتنی زیادہ تعریفیں کر رہے ہیں کہ دل کرتا ہے کہ کفن سے منہ نکال کر اس کے منہ پر تھوک دوں۔ جب تک میں زندہ تھا۔ مجھ سے حسد کرتے رہا، برائی کرتا رہا۔ گالی گلوج کرتا رہا۔ اب اچانک میں اس کی نظر میں اتنا اچھا کیسے ہوگیا! یہ منطقی فلسفہ۔ شاید ارسطو یا افلاطون ہی سمجھے۔

جیسے تیسے میرا جنازہ پڑھا گیا۔

مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑھ رہا کہ نماز جنازہ میں کونسی دعا پڑھی جاتی ہے۔ اکثر کو یہ معلوم ہی نہیں تھا۔ خیر ہو، عالم صاحب اور کچھ لوگوں کا کہ ان لوگوں نے سب کا فرض کفایہ ادا کیا۔

اب باری آئی، میرے لاش کو قبر میں ڈالنی کی۔ ایک تو قبر میں اترنے کیلیے کوئی تیار نہیں ہو رہا تھا۔ کہ کہیں میں

اسے اپنے ساتھ وہیں روک نا لوں۔ خیر میرا بیٹا اور پوتا اترا۔ اس میں بھی میرا بیٹا تو ڈر ہی رہا تھا۔ شکر ہے کہ پوتا عالم ہے اس نے صحیح سے اتار دیا۔ کچھ پڑھ اور لکھ بھی دیا۔ مگر اس وقت ان دونوں کو اتنی مفت کی ہدایات کہ ارے! ایسے رکھو۔ اس طرح کرو۔ اس طرح کرنا چاہیے۔ تقریباً سارے ہی لوگ نصیحت فرما رہے تھے۔ کچھ تو بالکل مفتی اعظم ہی لگ رہے تھے۔ اتنی زیادہ ہدایات کہ میرا دل کرتا تھا۔ کفن کھول کر نکل جائیں اور سب کو بول دوں۔ تم سب لوگ چلے جاؤ۔ میں خود ہی قبر میں لیٹ کر اوپر سے مٹی ڈال لیتا ہوں۔ مگر میں مجبور ہوں کیوں کہ میں مر چکا ہوں نا۔۔ ایک بار ایسا ہونا چاہیے تاکہ لوگ ڈریں۔

اب اس درمیان کچھ لوگ قبروں پر بیٹھے ہیں۔ کچھ باتیں کر رہے ہیں۔ کچھ مزاق مستی بھی۔ توبہ! توبہ! جب کہ یہ عبرت کی جا ہے تماشا نہیں ہے۔ خیر کسی طرح ان لوگوں نے دفن کیا۔ میرے پوتے نے اذان دی اور سوالات قبر پر ثابت قدمی کی دعا کی۔

اب مجھے الحمدللہ کافی سکون ہے۔ اور حضرات منکر نکیر کا انتظار۔۔

صبح سے ان لوگوں نے میرا دماغ خراب کر دیا تھا۔ اے کاش کوئی اس قبرستان میں ایسا مردہ آئے جس کے سارے رسومات شریعت اسلامیہ کی روشنی میں ہو۔۔ تو مجھے بہت خوشی ہوگی۔۔ حشر میں پھر ملیں گے اے میرے دوستو۔۔۔

ویسے شاید ان رسومات بد سے آپ کو گزرنا پڑے جو میں نے جھیلا۔۔ ان رسومات سے کس کو رستگاری ہے۔ آج ہماری تو کل تمھاری باری ہے۔۔

☆☆☆

آواز زیادہ، فیض کم

استاذ بننے کے بعد جو مسائل درپیش ہوتے ہیں ان میں سے ایک، سمت مخالف سے آوازوں کا آنا ہے مطلب آپ کسی کلاس میں پڑھا رہے ہیں دوسرے کلاس سے پڑھانے کی آواز بسا اوقات اتنی تیز آتی ہے بس دل کرتا ہے خود پڑھانا بند کر دیں اور سمت مخالف کی دلربا ہوشربا، دلنشیں، آواز سے لطف اندوز ہوں حالانکہ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ کوئی پڑوسی استاد بھی پڑھا رہا ہے مگر کسی کا کچھ خیال نہیں۔

مغرب کے وادیوں میں گونجی صدا ہماری
رکتا نہیں ہے کسی سے سیل رواں ہمارا

یہ اخلاقی اعتبار سے غلط ہونے کے ساتھ ساتھ فن تعلیم وتربیت کے اعتبار سے بھی یہ بہت بڑا عیب مانا جاتا ہے۔ کہ معلم زیادہ چیخ کر بولے، کیوں کہ یہ کانوں کو برا لگتا ہے طلبہ اکتاہٹ، تکھان محسوس کرتے ہے۔ خود معلم کی صحت کے لیے بھی یہ کافی نقصان دہ ہے، گلے کی خرابی، پھپھڑے کا جلد متاثر ہونا وغیرہ وغیرہ۔ (مفہومًا: فن تعلیم و تربیت)

جو اس شور سے میر روتا رہے گا
تو پڑوسی کاہے کو سوتا رہے گا

☆☆☆

دیہاتی کی بات

ایک بار ایک بڑے عالم دین کے پاس ایک دیہاتی شخص آیا اور ایک سوال پوچھا کہ جنتی زندگی کیا ہے عالم دین نے اس کو قرآن وحدیث کی روشنی میں جنتی زندگی کے بارے میں بتانا شروع کیا۔ یہ سب سن کر دیہاتی نے کہا جنتی زندگی یہ نہیں ہے بلکہ یہ کہ آدمی دن بھر کہیں بھی رہے مگر رات کو اپنے گھر والوں کے ساتھ رہے یہ ہے جنتی زندگی۔ یہ جواب سن کر اس عالم دین کے دل پر ایسی چوٹ لگی کہ واپس اپنے وطن آئے اور اپنے علاقے ہی میں تدریس شروع کی اور وہیں پر اپنی زندگی گزار دی واقعی گھر سے دوری کیا چیز ہے یہ رہنے والے ہی جانتے ہیں کیسی زندگی ہوتی یہ گزارنے والا ہی جانتا ہے۔

☆☆☆

مجھے یاد آیا

آج میرا ایک شاگرد مجھ سے ملنے آیا جو عمر میں بہت چھوٹا ہے تقریباً گیارہ سال کا مگر اولی پڑھ رہا ہے جب وہ سالِ اول پڑھ رہا تھا تو تعمیر ادب میں سبق سنانے کے درمیان اس نے ایک لفظ پڑھا سنکر (سین پر زبر نون ساکن) جسے سن کر کلاس میں ایک ہنسی کی بارش ہوگئی مجھے بھی بہت زیادہ ہنسی آئی پھر یہ واقعہ یادگار ہی ہوگیا اب اس میں اس بچے کی غلطی تھی یا قواعد املا کی رعایت نہ کرتے ہوئے سن کر الگ الگ لکھنے کی بجائے ملا کر ''سنکر'' لکھنے والے کی۔

اسی طرح کیرلا کے ایک کلاس میں ایک ٹیچر نے دھوم دھام کو الٹا کر دیا جس کی وجہ سے یہ لفظ دہام دہوم ہوگیا

پھر تو پورے کلاس میں دھام دھوم مچ گئی، وہ بولے سعودی عرب یہ جشن بڑے دھام دھوم سے مناتی ہے۔ گر چہ یہ لفظ کی الٹ پھیر تھی مگر اس نے اس میں ایک چاشنی پیدا کر دی تھی جس سے میں بار بار محظوظ ہوتا ہوں۔

☆☆☆

انتظار زیادہ لطف کم

آج مدنی قافلے کے لیے نکلا گھنٹہ دو گھنٹہ ٹرین کے انتظار کے بعد بڑی مشکل سے ٹرین آئی اور صرف دس سے پندرہ منٹ میں اپنے منزلِ مقصود کو پہونچ گئی۔ بہت زیادہ افسوس ہوا کہ کہ اتنی دیر کھڑے کھڑے انتظار کے بعد ٹرین کے سفر کا لطف نہیں اٹھا سکا۔ دراصل ہماری زندگی میں بھی ایسا ہوتا ہے کہ کسی کا ہم بہت بے صبری سے انتظار کرتے ہیں مگر جب وہ ملتا ہے تو کس طرح گزر جاتا ہے ہمیں پتا بھی نہیں چلتا اب وہ کوئی چیز بھی ہو سکتی ہے، کوئی انسان بھی ہو سکتا یا کوئی وقت یا موقع بھی

☆☆☆

آنسو

آنسو بھی ایک کیسا لفظ ہے نا بڑا عجیب سا آنسو سین کے شوشے بالکل آنکھ کے حلقے معلوم ہوتے ہیں اور اس پر نون کا نقطہ چھلکتا ہوا بے قرار آنکھ کا پانی، آنسو کا مد (ٓ) غم و پریشانی کے بادل معلوم ہوتے ہیں۔

اچھا یہ دیکھیں شاعروں نے آنسو کے بارے کیا کچھ لکھا ہے۔ یہ شاعر بھی بڑے درد اور آنسو والی باتیں کرتے ہیں۔

پلکوں کی حد کو توڑ کے دامن پہ آگرا
اک اشک میرے صبر کی توہین کر گیا

وہ عکس بن کے مری چشم تر میں رہتا ہے
عجیب شخص ہے پانی کے گھر میں رہتا ہے

ہوتا ہے اپنی آنکھ بھی بے وفا
وہ بھی نکلتا ہے تو کسی اور کے لیے

اچھا یہ کب نکلتا ہے اور کیوں نکلتا ہے؟ شاید جب درد تکلیف غم، صدمہ، ہجر، وصال اور انتقال کے الفاظ کا مصداق کوئی بن جائے۔اس کا ثبوت بھی ہے اقبال کا شعر۔

مبتلا بے درد کوئی عضو ہو روتی ہے آنکھ کسی
طرح ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ

آخری شعر:۔

اشک غم لے کر آخر کہاں جائے ہم
آنسوؤں کی یہاں کوئی قیمت نہیں

آپ ہی اپنا دامن بڑھا دیجیے
ور نہ موتی زمین پر بکھر جائیں گے

(رازالہ آبادی)

☆☆☆

وہ چلی گئی مجھے چھوڑ کر، میرے شیشۂ دل کو توڑ کر

بہت تلاش کیا، مگر نہیں ملی، ادھر دیکھا ادھر دیکھا، مگر کہیں نظر نہیں آئی۔آخر مجھے چھوڑ کر وہ کہاں چلی گئی، اس نے ایک بار بھی میرے بارے میں نہیں سوچا، کہ میں اس کے بغیر کیسے رہوں گا، کیسے چلوں گا، وہ بھی ایسی جگہ مجھے چھوڑ گئی، جہاں (بازار) اس کے بغیر رسوائی کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے، لوگ کیا سمجھے گے، کہ دیکھو! وہ اس کو چھوڑ کر چلی گئی ہے۔اور یہ اس کے بغیر ہی زندگی کا سفر کر رہا ہے، اب میں کس کس کو بتا تا رہوں، کہ میں بے وفا نہیں، بلکہ وہ بے وفا تھی، جو مجھے بے یار و مددگار چھوڑ کر چلی گئی، حالانکہ وہ مجھے بہت پسند تھی۔ میں نے اس کو دنیا والوں کی ناپاک نظروں سے چھپائے رکھا تھا۔مگر ہائے رہے دشمن کی نظر۔

خیر اب وہ کہیں بھی کسی کے ساتھ ہو، خوش رہے، اور اس کو راحت وسکون پہنچاتے رہے جس نے میری چپل کو

مسجد سے بہلا پھسلا کر بھگا لے گیا۔

☆☆☆